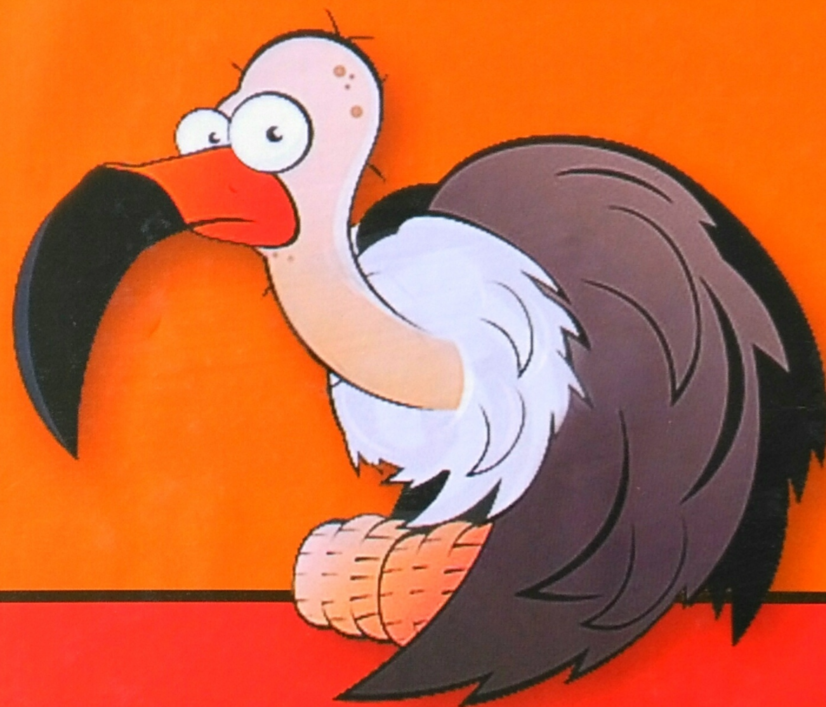
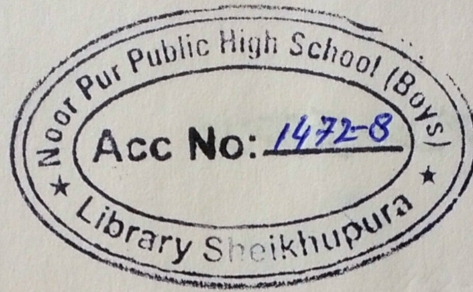
راجہ گدھ



تنقیدی جائزہ

غلام حسین غازی



راجہ گدھ

تنقیدی جائزہ

غلام حسین غازی

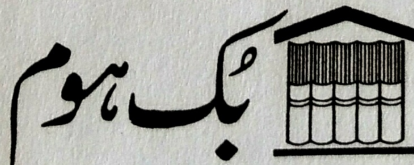
BOOK HOME

راجہ گدھ

تنقیدی جائزہ

غلام حسین غازی

اہتمام	رانا عبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
اشاعت	2017ء
قیمت	400 روپے
ناشر	بک ہوم لاہور



بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

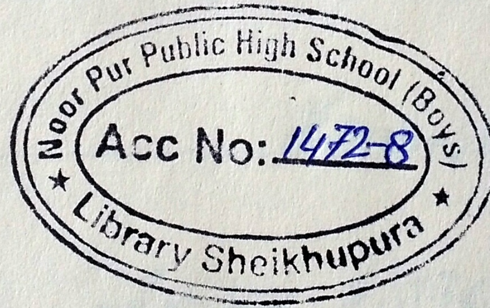
فون:042-37231518-37245072

bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com

انتساب

علی عباس جلالپوری

کے نام



فہرست

دیباچہ

محترمہ بانو قدسیہ کے معروف ناول ''راجہ گدھ'' پر انگریزی ادب کے استاد اور عملیت پسند دانشور غلام حسین غازی کے تنقیدی جائزے کا مسودہ دیباچہ لکھنے کے لیے ملا۔ میرا پہلا ردعمل حیرت و استعجاب کے ساتھ سوال تھا کہ ایک عملیت پسند سکالر نے کافی عرصہ پہلے چھپنے والے ناول ہی کو تنقیدی جائزے کے لیے کن اسباب و وجوہات کی بنا پر منتخب کیا ہے، جواب دیا گیا۔ آپ مسودے کا مطالعہ کیجیے سوالات کے جواب اور اشکال آپ پر خود بخود واضح ہوتی چلی جائیں گی۔ غازی صاحب کے تنقیدی جائزے کو پڑھنے کے بعد حقیقتاً محسوس ہوا کہ اس پر جو سوال اٹھائے گئے ہیں ان میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے خود تنقیدی جائزہ لکھنے کے بارے کتاب میں کچھ یوں واضح کیا ہے کہ ماہ اپریل 2016ء میں کچھ نوجوان سٹوڈنٹس نے مجھ سے محترمہ بانو قدسیہ کے ناول ''راجہ گدھ'' کے بارے میں رائے مانگی تو میں نے اُن سے مہلت طلب کرتے ہوئے اپنے کتب خانے سے ''راجہ گدھ'' نکال کر اس کا تجزیاتی مطالعہ شروع کر دیا۔ جس سے کئی مخفی حقیقتیں واضح ہو کر خود سوال بن گئیں۔ اور پھر یاد آیا کہ 1981ء میں بھی کچھ ترقی پسند حلقوں نے اسی ''راجہ گدھ'' کو اکرام اللہ کے ناول ''گرگِ شب'' سے ماخوذ قرار دیا تھا۔ ''گرگِ شب'' جسے (مردِ مومن) ضیاء الحق کی آمریت میں ممنوع قرار دیا گیا اگر

چھپ گیا ہوتا تو ایک تہلکہ خیز اور فکر انگیز ناول ہوتا۔ مگر آمریت کو ضرورت تھی کہ ایسی سوچ پروان چڑھائی جائے جو نہ صرف مصلحت پسندی بلکہ حق گوئی سے انحراف اور عافیت پرستی کے نظریے کو فروغ دے۔ آزادی جمہوریت اور انسانی حقوق کی تعبیر تلاش کرنے کے راستے پہ لگانے کی بجائے بے عمل گفتاری تصوف کے سحر میں مقید کر کے نوجوان نسل کو معاشرے کا عضو معطل بنانے کی کوشش کی گئی۔ کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے اور آزادی سے فیصلے کرنے کے سرچشمے دانستہ طور پر اور گہری منصوبہ بندی سے ہمیشہ وہاں بند کیے جاتے ہیں جہاں سماجی نظام کی بنیاد جبر و استبداد اور ناجائز حاکمیت اور اقتدار پر رکھی جاتی ہے۔ غلام حسین غازی کے نزدیک محترمہ بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' بالخصوص بلکہ دونوں میاں بیوی سمیت اس قبیل کے دوسرے لکھاریوں کی تحریریں بھی فکری تعطل پیدا کرنے اور نیم غنودہ سماج کو اپنی تحریروں کی لوری سے سُلا کر حاکمانہ التفات سے بہرہ مند ہونے کی کوشش لگتی ہیں۔

غلام حسین غازی اپنے تنقیدی جائزے میں اس جوڑے کے آمریت پسند رویے سے اپنی تحریروں میں کئی جگہوں پر شاکی اور معترض نظر آتے ہیں۔ مثلاً غازی صاحب کے بقول اشفاق صاحب تلقین شاہ کا پروگرام خالص پٹیالوی زبان میں کرتے ہوئے کونسی مقامی ثقافت یا زبان کی نمائندگی اور اس کی کون سی خدمت کرتے رہے۔ ایوب خان جیسے ڈکٹیٹر اور آمر کو کس بنیاد پر مردِ درویش قرار دے کر فقیر کی سند عطا کی۔ ''راجہ گدھ'' کے صفحہ 18 پر تخلیق کردہ کردار پروفیسر تنویر جو عملیت پسند اور مارکسی فلسفے کا حامی ہے اس کو محترمہ بانو قدسیہ اپنے ہی شاگردوں سے لاجواب کرواتی اور تضحیک کا ہدف بنواتی ہیں۔ کیا یہ رویہ اس بات کا غماز نہیں کہ فقر و تصوف کے لبادے میں بھی ان

کی سوچ سرمایہ دارانہ نظام کے زرپرست فلسفہ سے ہم آہنگ تھی اور سماجی انصاف کے داعی پروفیسر کی تضحیک کرواتے ہوئے محترمہ دراصل اپنی فکری تسکین کا سامان پیدا کر رہی تھیں۔

اسی ناول ''راجہ گدھ'' کا ایک اور کردار امتل نامی خاتون جو پیشے کے لحاظ سے سیکس ورکر ہے۔ اس کی زبانی محترمہ بانو قدسیہ نے بار بار حلال وحرام کے فلسفے پہ بحث اور فکرمندی پیدا کرتے ہوئے گویا ناول کے اندر ناولٹ پیدا کر دیا ہے۔ اور خصوصی طور پر امتل کا یہ فقرہ کہ رزق حرام کی بدولت شاید ہم لوگ تو کبھی نارمل بچے پیدا ہی نہیں کر سکیں گے۔ غلام حسین غازی یہاں بھی حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر متذکرہ بالا فلسفہ کوئی حقیقت رکھتا تو یقینی طور پر بانو قدسیہ کی طرف سے رزق حرام کے ثمرات کی تشریح کے مطابق شاہی محلّہ تو کلی طور پر ایک پاگل خانے میں تبدیل ہو چکا ہوتا۔

ایک اور جگہ محترمہ بانو قدسیہ نے اپنے افسانے دست بستہ میں میاں بیوی دو پڑھے لکھے کرداروں کا جو تارک الدنیا درویش ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس پر بھی عملیت پسند غازی انتہائی شاکی نظر آتے ہیں اور حقیقی اور عملی تصوف کے شارع نظام الدین اولیاؒ کی تعلیم کا حوالہ فوادالفواد میر حسن کے حوالے سے کچھ یوں دیتے ہیں۔

'' رہبانیت اور اذیت کوشی کی کوئی ضرورت نہیں بشرطیکہ انسان خدا پر دھیان رکھے۔ دنیاوی اشیاء کو ذاتی مفاد کے بغیر استعمال کرتا رہے۔ ذاتی املاک، اونچا سماجی مرتبہ اور مادی کامیابیاں انسان کو مادی دنیا کے ساتھ جوڑتی ہیں'' یہاں پر محترمہ سمیت اس گروہ کے گفتاری صوفیا کے فکروعمل کا تضاد واضح ہوتا ہے۔ جو قال پر زور دیتے ہیں

اور خود حال سے بے خبر رہے۔ اپنے افسانے دست بستہ میں محترمہ اس اعلیٰ تعلیم یافتہ جوڑے کو تارک الدنیا درویش پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ گویا نوجوان نسل کو تارک الدنیا ہونے کی ترغیب دیتی ہیں اور خود آپ ساری زندگی اونچے سماجی مرتبے ذاتی املاک اور پُر آسائش زندگی کے لیے کوشاں اور حکمرانوں کی قربت حاصل کرنے کے لیے ان کے قصیدہ خواں اور آمروں کو درویش قرار دیتے رہے۔ اگر یہ سب کچھ فکر وعمل کا تضاد اور روحانی نرگسیت نہیں تو اور کیا ہے؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقی تصوّف نے عوام کے تخیلات، عمل کردار اور عقائد پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مگر عملی صوفیاء کی تعلیم ایثار اور خلوص نیت کے ساتھ بقول نظام الدین اولیاء اونچے سماجی مرتبے کے تعاقب اور پرہیز میں مضمر تھی۔ لیکن اس کتابی تصوّف میں وہ بات بنتی نظر نہیں آئی جو صوفیا کی تعلیم کی بنیاد ہے۔ طبقات اولیاء کی کتابوں میں ان نیک نفوس بزرگان کی زندگیوں کا مطالعہ کیجیے ایک بات مشترک طے کی کہ حقیقی صوفیا نے کسی بھی حالات میں اپنی تعلیم اور سوچ کو حکمرانوں کے استبداد کا یرغمال ہونے دیا اور نہ ان جدید گفتاری صوفیاء کی طرح آمر حکمرانوں کے قصائد لکھے۔

راست فکر اور عملیت پسند دانشور غلام حسین غازی نے ''راجہ گدھ'' میں بیان کیے گئے فلسفے کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ایک ایک لفظ کو حقائق کے ترازو پر تول کر نہ صرف ''راجہ گدھ'' بلکہ محترمہ بانو قدسیہ اور جناب اشفاق احمد کے گفتاری اور کتابی تصوف کے نظریے پر کئی سوال کھڑے کر دیئے ہیں۔ اور ان میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔

غلام حسین غازی کی نظر میں باطنی اور مخفی تصورات کے خاتمے اور تشریح عالم کے میکانی فلسفے کے دور میں رزق حرام کے نتائج کے طور پر خون کے خلیوں کی شکست وریخت

کا نظریہ موجود سائنسی تحقیق اور گہرے سماجی مطالعے کے ترازو پہ بے وزن ہو چکا ہے۔ میکانی فلسفے کی جزئیات نے جدید عصبی فعالیات کے علم، نیوروفیزالوجی اور ادراک کے مفروضات کا راستہ بھی ہموار کیا۔ اب جسم اور ذہن کے تنازعہ کا کوئی باقاعدہ وجود نہیں۔ اب دنیا جو ہے، سو ہے۔ بقول غازی بانو قدسیہ جیسے لوگ من گھڑت مسائل کی باریکیاں ایجاد کر کے ان پر مفروضات اور مخصوص نظریات کا ٹھپہ بھی لگا سکتے ہیں۔ اور ان کے حل کے لیے اپنے پیش کردہ مبہم مفروضوں کو تصوّف یا روحانی سائنس کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ اس سارے کھیل تماشے میں حقیقی فلاحی علوم کے لیے جن سے انسانیت کا کوئی فائدہ ہو سکے قطعاً کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

غلام حسین غازی کا استدلال ہے کہ اب وہ مقام آ گیا ہے کہ جہاں ہم ایسے لکھاریوں کی دانشورانہ ذمہ داریوں پر سوال اٹھا سکتے ہیں کہ جنہوں نے آزادی ضمیر، جمہوریت اور دیگر انسانی حقوق کے خوابوں کی تعبیر اور تلاش کی راہ دکھانے کی بجائے محض سراب دکھائے۔ دانستہ طور پر ایسا ادب تخلیق کیا جو بالادست طبقات کی مرضی کے عین مطابق اور جس کا حقیقی سماجی مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ مسائل کو حل کرنے یا سلجھانے کی بجائے فراریت کی ترغیب میں معاون ثابت ہوا۔ غلام حسین غازی اکثر وضاحت کرتے ہیں کہ میں حقیقی یا عملی تصوّف کا معترف ہوں مگر صوفی کا کردار بجائے خود اس کا شارع ہو جیسے کہ عصر حاضر میں ڈاکٹر افتخار بخاری اپنے مکتب کی تعلیمات کی تفسیر اپنے کردار سے پیش کر رہے ہیں۔ اور میں ان کا ہم مکتب ہوں اگرچہ غلام حسین غازی نے اپنے تنقیدی جائزے میں کہیں کہیں تلخ انداز میں گفتگو اور ''راجہ گدھ'' سے ہٹ کر بانو قدسیہ کے دیگر افسانوں سمیت اشفاق احمد اور قدرت اللہ شہاب کی تحریروں کو

بھی ہدف تنقید بنایا اور ان کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ مگر اس وسیع تناظر کے تنقیدی جائزے کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ ''راجہ گدھ'' ناول اگرچہ محترمہ بانو قدسیہ کے نام سے موسوم ہے لیکن اُن کے بقول اس کی تخلیق ایک مشترکہ ذہنی روّیے کی مرہون منت ہے۔ جو ان متذکرہ بالا اصحاب ادب میں پایا جاتا تھا۔

غلام حسین غازی کے تنقیدی جائزے پر تحریر ہذا حتمی رائے نہیں۔ بہر حال حتمی تبصرہ قارئین نے کرنا ہے۔

گل سلطان اعوان

اوگالی، وادی سون سکیسر

باب 1

وجہ تنقید

اپریل 2016ء میں کچھ نوجوان کالج سٹوڈنٹس نے رجوع کیا اور بانو قدسیہ محترمہ کے مشہور ناول راجہ گدھ پر رائے مانگی۔ ان بچے بچیوں سے مہلت طلب کی۔ اپنی سکول لائبریری سے راجہ گدھ نکلوایا اور جب پڑھنا شروع کر دیا تو دماغ 1981ء میں پہنچ گیا۔
جب یہ ناول چھپا تھا تو کچھ روشن خیال ادبی حلقوں میں یہ خبر گرم ہوئی تھی کہ راجہ گدھ جناب اکرام اللہ کے 1978ء میں چھپنے والے ناولٹ ''گرگِ شب'' سے ماخوذ ہے اور ڈکٹیٹر نواز ناول ہے۔
اب جب راجہ گدھ پڑھ لیا تو جستجو ہوئی کہ اکرام اللہ کا ناولٹ ''گرگِ شب'' بھی ڈھونڈا جائے جو 1978ء میں چھپا تھا جسے ضیاء حکومت نے فوراً Ban کر دیا تھا۔ لاہور سے ایک دوست کی وساطت سے ایک دن فوٹو کاپی کی شکل میں 198 صفحات پر ناولٹ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک موصول ہو گیا۔ ناولٹ خیالات کا ایک طوفان ہے۔ جب اُسے راجہ گدھ کے مقابل رکھا تو دونوں ایک دوسرے کی تصویرِ معکوس نظر آئے۔ چونکہ وہ Ban ناولٹ ہے اس لیے تفصیل میں جائے بغیر اتنا ہی گوش گزار کروں گا کہ وہ ناولٹ اگر واقعی ایک فکری طور پر آزاد معاشرہ میں چھپتا تو شاید آج تک کے تہلکہ خیز ناولوں میں سے ایک ہوتا۔ اور پاکستان میں وہ شاید قبل از وقت چھپ گیا۔ ''گرگ شب'' کے مصنف نے ڈکٹیٹر شپ کے اُس تاریک سنسر شپ کا جواب 1977ء میں ایک افسانہ

''سیاہ آسمان'' لکھ کر دیا۔ لیکن گیارہ سالہ ڈکٹیٹرشپ کے تاریک دور میں پاکستانی ادب شاید اب تک بھی اپنی مزاحمتی اور حق گوئی کی رُوح سے عاری ہو چکا ہے۔ مصلحت پسندی، اصلاح کاری، تصوفانہ پسِ منظر میں لکھے گئے ناول اور ناولٹ عوامی ذوق کی پہچان بن چکے ہیں۔ معیاری فلموں کی عدم پیداوار کی وجہ سے اخلاق باختہ سٹیج ڈرامہ نے فروغ پایا اور پچھلے اڑتیس سال میں پروان چڑھنے والی نسلیں ایک مضبوط اور سنجیدہ ادب سے روشناس ہونے کی بجائے سٹیج ڈراموں کے انداز میں ہر چیز کو سننے بولنے کی عادی ہوگئی ہیں یعنی ادب برائے تبدیلی ناپید ہے۔ انگریزی ادب یا علاقائی ادب میں اگر کوئی مزاحمتی اور ترقی پسندی کا کام ہوا یا ہو رہا ہو تو یہ اس وقت میرا موضوع نہیں۔

اب چلتے چلتے خیال سوجھا کہ کیوں نہ بانو قدسیہ کے لکھے گئے تمام ناول، ناولٹس، افسانے اور ڈرامے بھی پڑھ لوں تاکہ جب سے انہوں نے لکھنا شروع کیا تب سے لیکر راجہ گدھ لکھنے تک کی تخیلاتی ترقی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ لہٰذا اُن کی تیس کتابیں منگوا لیں۔ راجہ گدھ سے پہلے ایک اور ناول ''شہرِ بے مثال'' اور تین ناولٹس بعنوان ''موم کی گلیاں''، ''پُروا'' اور ''ایک دن'' اور پھر 2000ء کے بعد چھپنے والا ناول ''حاصل گھاٹ'' اور اس کے علاوہ اُن کے تمام مجموعہ ہائے افسانہ بھی پڑھ ڈالے۔ پھر اُن کی قدرت اللہ شہاب پر لکھی تحریر ''مردِ ابریشم'' نے انہیں سمجھنے کی راہ دکھائی مگر ''راہ رواں'' وہ کتاب تھی جسے میں نے ذوق وشوق سے پڑھنا شروع کیا کہ یہاں پر اپنے قلم کی مہارت سے لڑکے اشفاق احمد، پھر نوجوان اشفاق احمد خان B.A اور پھر بزرگ اشفاق احمد خان کے بارے میں کیا لکھتی ہیں۔ 600 سے زائد صفحات پر کسی کے بھی حالاتِ زندگی تفصیل سے آسکتے ہیں مگر اس سوانح کو پڑھ کر ایک واضح تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ آپ نے جو روانی وسلاست ''پُروا''، ''ایک دن'' یا پھر ''شہرِ بے مثال'' لکھتے وقت دکھائی وہ اشفاق احمد خان کی سوانح لکھتے وقت کہیں کھو دی ہے۔ یا پھر یوں کہہ سکتے ہیں کہ اشفاق احمد

خان، قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی جیسے محسنین و مربیان کا سایہ ناپید ہو چکا تھا جو یوں بکھری اور بعض جگہ بے ربط تحریر نظر آتی ہے۔ بہر حال جہاں جہاں منظر نگاری میں جان ہے وہاں وہاں میں نے ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ ساتھ سفر کر لیا۔

آپ سب کا تجربہ ہو گا کہ کسی خاص لکھاری کا ایک خاص نقطہ نگاہ اس کی ادبی پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور پھر وقت کے ساتھ اس میں نکھار آتا جاتا ہے۔ یا پھر وہ ہی ایک خاص لکھاری زندگی کے تجربات سے گزر کر یکسر اپنا نقطہ نگاہ تبدیل کر جاتا ہے۔ بانو قدسیہ کی سوچ ہلکے پھلکے معاشرتی مسائل پر استوار ہوئی جن میں محبت کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں مگر کہیں کہیں ہمیں وہ روایت سے ہٹ کر خاص سماجی مسئلہ کی طرف جاتی دِکھتی ہیں جیسے کہ افسانہ ''کلو'' پھر ''کال کلیچی''۔ افسانہ ''امر بیل'' میں ایک نوجوان لڑکی کی اپنے والد کے ہم عمر سے یک طرفہ محبت کی کیمسٹری سمجھ نہیں آتی جبکہ وہ لڑکی ایک بالکل نارمل اونچے طبقہ کے ایک خاندان کی اکلوتی اولاد ہے۔

ان کی تحریروں میں زیادہ تر ایک پروفیسر جس کی 300 روپے تنخواہ ہے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ پھر ابتدائی ناولٹس اور افسانوں میں غیر ملکی سیاحوں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ناولٹ ''ایک دن'' ''پروا'' اور ''موم کی گلیاں'' چھوٹے چھوٹے خیالات کو وسیع تناظر میں دکھاتے ہوئے پوری کہانی بنا دیتے ہیں۔ آپ کو ابتدائی پاکستانی معاشرت کا مزہ لینا ہو تو یہ ناولٹس اور ''شہر بے مثال'' پڑھنا چاہیے۔

ان کے ناولٹ ''پروا'' کے صفحہ 107 تا 108 پر ڈکٹیٹر نوازی کا پہلا ثبوت کچھ یوں ملتا ہے۔

''اس روز سکول کا آخری دن تھا ابا جی کا رقعہ میرے پاس دھرا تھا جس میں 2000 روپے انہوں نے منگوائے تھے۔ 1000 میرے پاس بینک میں موجود تھا۔ ایک ہزار سکول کے فنڈ میں۔

پھر اختر مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ تم Ballu Cinatuin کو
جانتے ہو نا۔ جانتے ہو۔"

"اب جانوں گا لاہور جا کر" اختر نے اسے گہری نظروں سے ٹٹول
کر کہا۔ وہ ہنس کر بولی "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میرا وہم ہے لیکن
سچ اختر جب میں نے سکول کے فنڈ کا چیک کاٹا اور اس پر دستخط کر
لیے تو مجھے لگا دفتر کے دروازے میں سے کسی نے میری طرف
دیکھا ہے میں نے مڑ کر نظر کی تو۔۔۔۔۔۔۔۔

"تو۔۔۔۔۔۔۔"

"صدر ایوب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر صدیوں کا کرب تھا۔
اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں صوفیہ! صوفیہ جب تم جیسی لڑکیاں ایسا
کریں گی تو پھر ہم اوروں سے کیا توقع کریں گے۔

"تم صدر ایوب سے بہت متاثر ہو۔" اختر نے زہر خند کے ساتھ
پوچھا۔ "کیوں بھلے لوگوں سے متاثر ہونا کیا کوئی معیوب بات
ہے؟"

"لیڈر کبھی بھلے نہیں ہوتے۔ صوفیہ بیگم۔"

"جب شیشے میں کھڑا درویش غائب ہو گیا۔ اور میں نے چیک
پھاڑ دیا تو سامنے والی دیوار پر لگا ہو کیلنڈر پھڑ پھڑا رہا تھا اور اس
پر بنی ہوئی فیلڈ مارشل ایوب کی تصویر میں اُس کرب کا رتی بھر بھی
موجود نہ تھا جو میں نے کھلی آنکھوں دیکھا تھا۔"

یہ ناول یقیناً ایوب خان کی ڈکٹیٹرشپ کے دوران لکھا گیا۔ اور آپ "مردِ ابریشم"
اور "راہ رواں" میں اپنے جس خوف اور سماجی ترقی کے لیے جدو جہد کا بار بار ذکر کرتی

ہیں اس نے انہیں مجبور کر دیا ہو گا کہ وہ چڑھتے سورج کو سلام کرتی رہیں اور پرامن رہیں۔ کسی ادب پارے میں اس طرح سے ایک غاصب کو ولی اللہ قرار دینا ان کی اس سوچ کا نتیجہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جرنیل کی تعریف کر رہی ہیں جس نے گندھارا انڈسٹریز کرپشن کی کمائی سے بنائی۔ جس نے اپنی کتاب "Friends not Masters" سرکاری فنڈ سے چھپوائی۔

جس کے بیٹے نے محترمہ فاطمہ جناح کی توہین کی خاطر ہیجڑوں کو محترمہ فاطمہ جناح کے روپ میں گلی گلی گھمایا۔ جس نے لیاقت آباد، کراچی میں محترمہ فاطمہ جناح کے حامیوں پر اپنے سرکاری عہدے کو استعمال کرتے ہوئے گولیاں برسائیں اور متعدد قتل کر دیئے یا زخمی۔

خاوند تو سرکاری ملازم تھے۔ خود سرکاری ملازم نہ تھیں۔ پھر کیوں ڈرتی رہیں۔ بانو محترمہ کو اگر عوام سے محبت یا جمہوری روایات کی پاسداری کا کچھ بھی خیال ہوتا تو ایوب خان جس کو عوام نے بزور حکومت سے اتارا۔۔۔ تو عوام سے معافی مانگتیں یا پھر کم از کم ''پروا'' کے آئندہ ایڈیشن میں اُس جعلی درویش کے متعلق یہ صفحات ختم کر دیتیں۔ مگر ان محترمہ نے بھی اس ظالم ڈکٹیٹر کی طرح عوام کو غلاموں سے زیادہ درجہ نہ دیا۔ ایوب خانی دور میں ہی حسن ناصر جیسے دانشور کو قلعہ لاہور میں اذیتیں دے کر مارا گیا۔ آپ محترمہ نے ایک آرٹیکل بھی جھوٹے منہ سے نہ لکھا۔ افسانوں کا مجموعہ ''کچھ اور نہیں'' میں ''کال کلچی'' میں حسن و قبح پر لکھا ہے۔ اور مملکت خداداد پاکستان کی اساس جمہوریت کو قرار دیتے ہوئے خاندانی اونچ نیچ کو نشانہ تنقید بنایا ہے۔ اس افسانہ میں پہلی بار پرندوں کی زبان استعمال کی ہے۔ ان کے ہاں وہ باتیں جو انسانی کرداروں سے کہلوانا مشکل یا قابلِ تعزیر لگتا ہے وہ پرندوں کی زبانی گرفت سے باہر ہو جاتی ہیں۔ یہی تکنیک انہوں نے راجہ گدھ میں کُھل کے استعمال کی ہے۔ ہندی دیو مالا اور ہندی استعارے استعمال

کرنا ان پر ختم ہے۔ یہ ان کی اشفاق صاحب سے مجلس کا نتیجہ ہے یا پھر ان کی ابتدائی تعلیم جو انڈین شہر دھرمسالہ میں ہوئی اس کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس مجموعہ میں کہانی نما افسانہ ''بکری اور چرواہا'' یا تو کسی انگریزی کہانی کا چربہ ہے یا پھر انداز تحریر میں انتہائی مختلف ہونے کی وجہ سے کسی اور سے لکھوایا گیا ہو گا۔ پڑھ کر خود رائے قائم کیجیے۔ ان کا افسانہ ''کِرکل'' سیاسی پسِ منظر میں لکھا ہوا ہے اور بھٹو دور میں بے یقینی، اداسی اور مایوسی کی فضاء دکھائی گئی ہے۔ بھٹو صاحب کی مخالفت واضح ہے جب ''مردِ ابریشم'' صفحہ 100 پر لکھتی ہیں کہ بھٹو صاحب کی حکومت کے آغاز میں ہی میں نے بھٹو کا انجام ایک خواب میں دیکھ لیا تھا۔ ایک اور بھی خواب دیکھا اور دونوں خواب ممتاز مفتی کو لکھ بھیجے۔ پھر'' کچھ اور نہیں'' میں زبان کوئی اعلیٰ درجہ کی استعمال نہیں کی۔ جنسی خواہشات کا اظہار بہت لطیف پیرائے میں کرتی ہیں اور آخر میں یکدم جھپکی مار جاتی ہیں۔ اس مجموعہ میں خصوصاً اور باقی افسانوں اور ناولٹس میں جھگیوں اور ٹھٹھیوں میں خالص دیسی زبان کے الفاظ مرکبات اللہ جانے انہوں نے کہاں سے سیکھے اور استعمال کیے جو بعد ازاں تحریروں میں بہر حال کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ان کے افسانوں کے مجموعہ ''ناقابلِ ذکر'' میں ان کا شاہکار افسانہ ''روس سے معذرت کے ساتھ'' روانی، سلاست اور دلائل میں لاجواب ہے۔ محترمہ بانو قدسیہ نے اپنا پورا زور صرف کر دیا ہے تہذیبِ مشرق کی سربلندی اور روسیوں کی مستعار لی ہوئی تہذیب کو نیچا دکھانے میں۔ مگر آپ اگر تھوڑا باریکی اور خوب توجہ لگا کر پڑھیں تو بطور مشرقی دانشور بانو محترمہ اپنے ہی دلائل سے مات کھا گئی ہیں جب وہ صفحہ 223 پر لکھتی ہیں:

> ''کسی ملک، شہر، کسی موسم کو جاننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کسی واقعے یا انسان کی مہر لگ جائے ورنہ جگہوں کو دیکھ لینے

سے کبھی وہاں کا کچھ یاد نہیں رہتا۔ شہر، ملک اور موسم ہسٹری یا جغرافیہ میں محبوس نہیں رہ سکتے۔ لمحوں میں زندہ رہ جاتے ہیں۔ جب میں نیا نیا روس گیا تو میرا خیال تھا کہ موسکاؤ کو جاننے کے لیے مجھے وہاں کی تاریخی عمارتیں، ان کالٹریچر ان کے اخبار، رہن سہن کا طریقہ اچھی طرح نوٹ کرنا چاہیے۔''

پھر صفحہ 224 پر یوں فرماتی ہیں:

''یوں سمجھئے روسی آرکیٹکٹ میں عمودی تسلسل ہے۔ وہ دوسرے ممالک سے جو کچھ بھی مستعار لیتے ہیں کچھ اسے مشرف بہ روس کرتے ہیں کہ وہ چیز وہ سٹائل ساختہ روس بن جاتا ہے۔ کیف میں سینٹ صوفیہ کا گرجا جو امّ گرجاہات ہے بازنطینی اثرات کا حامل ہے۔ کریملن کے دو اہم گرجے لاطینی سٹائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پیٹرز برگ کا تمام عمارتی سرمایہ جرمن، فرانسیسی ،اطالوی اثرات سے پُرکشش بنا ہے۔ نیو ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی جس کا میں طالب علم رہا ہوں سکائی سکریپرز کے انداز پر بنی ہے اور اس میں بتیس منزلیں ہیں۔ کریملن کے خوبصورت موتف انگریزوں کی احیا کی خوشبو میں بسے ہیں لیکن روسی لوگ باگ ان اثرات کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ روس کا سب کچھ ان کا اپنا خود ساختہ ہے۔۔۔ اور آرٹ سے لے کر سائنسی ترقی میں بھی دوسروں کا ہاتھ رہا ہے۔''

پھر صفحہ 225 اور صفحہ 226 پر ملاحظہ ہو کہ کس طرح مندرجہ بالا پیراگرافس میں اپنے قائم کئے ہوئے تھیسس کو anti thesis میں تبدیل کرتی ہیں لیکن اس ہلکی سی شعوری

چمک کو اپنے سماج پر منطبق کر کے قوم کو درست سمت میں نہیں لے جاتی ہیں۔

''عمارتوں کے چکر سے نکل کر میں نے میوزیم کھنگالنے شروع کر دیئے۔ آرٹ کا جس قدر خزانہ موسکاؤ اور لینن گراڈ میں ہے اسے ہی دیکھنے کے لئے ایک عمر کافی نہیں۔

پشکن عجائبات آرٹ تھرڈ ورلڈ کے مسافر کو ہمیشہ کے لیے تھکا دینے کو کافی ہیں۔ روس کا آرٹ دراصل آرتھوڈاکس عیسائیت سے بہت شدید طور پر وابستہ ہے۔ اس کا آرٹ con painting سے نکلا ہے۔ پہلے پہل وہاں کے آرٹسٹ حضرت مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور مذہبی روایات کو محفوظ اور قابلِ احترام بنانے کے لیے تصویریں اور بت بنایا کرتے تھے۔ پھر جب منگول حملے شروع ہوئے اور ایشیائی لوگ یہاں رہنے بسنے لگے تو ساتھ ہی یونانی آرٹسٹ بھی آپہنچے۔ ملکہ الزبتھ کے دورِ حکومت میں بہت سے اطالوی اور فرانسیسی آرٹسٹ یہاں کام کرتے تھے لیکن اٹھارہویں اور بیسویں صدی میں یورپ کا اثر بیحد نمایاں رہا۔

رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا سوشلسٹ ڈائینمکس کے تحت ایک خاص قسم کا ادب اور بتوں کا رواج عام ہوا۔ میکسم گورکی کے ساتھ جو حقیقت پسندی شروع ہوئی تھی وہ لینن کے عہد میں Monuments کی شکل اختیار کر گئی۔ اس نے فرداً فرداً بھی اور گروپس کی شکل میں بھی یادگاریں تعمیر کروائیں۔

لیکن کچھ عرصہ بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی ملک کا آرٹ، مصوری، بُت تراشی، یہ سنگِ میل ضرور ہیں لیکن یہ بھی تمام تر اس

ملک کی نمائندگی نہیں کر سکتے ۔ ہر آرٹ اپنے عہد میں محبوس ہوتا
ہے اور جس طرح ایک عہد ختم ہونے کے بعد کڑی تو بن جاتا ہے
لیکن زندہ نہیں رہتا۔ ایسے ہی کسی ملک کا آرٹ نشان دہی تو کرتا
ہے پر ملک نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ہمارے دیس کی Miniature
مصوری ہمیشہ زندہ رہنے والی تو ضرور تھی لیکن پاکستانی نہیں تھی۔

یہ تمام دلائل وہ کمیونسٹ روس کی عمومی تنقیص کی خاطر لکھ رہی ہیں مگر جذباتیت میں یکسر بھول جاتی ہیں کہ مسلمانانِ برصغیر کس طرح اپنے کلچر اور ثقافت کو زمینی قرار دیتے ہیں، البتہ ہندوستان کے ہندو سینہ ٹھوک کے اپنے قدیم کلچر و ثقافتی علامتوں پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہم مسلمانانِ برصغیر ہندو سے مسلمان ہو کر جہاں بہت سارے روحانی فیوض و برکات سے مستفید ہوئے وہاں ہم نے اپنی زمین اور ہزاروں سالوں کی فخریہ تاریخ کو بھی کھو دیا۔ آج بانو محترمہ پنجاب میں شاید ہی کوئی پنجابی نام دکھا سکیں۔ آپ محترمہ ہرگز شناخت نہ کر سکیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے لیکر آج تک پاکستانی قوم ایک باقاعدہ قوم بننے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ پوری یا مابعد آزادی کی نسلیں ہندو رسوم ورواج سے منسلک رہیں۔ خود آپ محترمہ اور اشفاق مرحوم ہندی زبان سے نہ نکل سکے بلکہ فخر سے چالیس سال تک پٹیالے کی زبان میں تلقین شاہ پیش کرتے رہے۔ کیا انہیں محبتِ وطن میں ادراک نہ ہوا کہ ہم ایک نئی قوم کے نمائندے ہیں تو تلقین شاہ صاحب لاہوری زبان، پوٹھوہاری زبان، جنوبی پنجاب کی زبان، پنجاب کی جانگلی زبان یا چار بڑی صوبائی زبانوں کے مکسچر سے ایک نئی زبان کے تارُو پود کی بنیاد رکھتے جو چالیس سال میں بطور پاکستان زبان خوب پاپولر ہو چکی ہوتی۔ English Medium of Instruction کی وجہ سے آج ملک میں ایک نئی زبان Urdish کی داغ بیل پڑ چکی ہے۔ مگر یہ فہم نہ تھا۔ پاکستان سے محبت اسلام سے محبت کا دعویٰ کرتے کرتے یہ ادبی جوڑا (دونوں میاں

بیوی) ایسی نرگسیت کا شکار ہو گئے کہ انہیں کوئی اور اپنے سے بڑھ کر محب وطن نظر آنا ہی بند ہو گیا۔ ملک کی نئی پود اپنی لسانی ترکیب، نظریات میں اتنی دور نکل چکی ہے کہ اسے پٹیالوی زبان میں دی گئی تلقینیں اب شاید مذاق ہی نظر آئیں۔ جدید ادیبوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے کام سے بیوروکریٹس، عدلیہ اور فوجی آفیسرز کو اعلیٰ درجہ کی رہنمائی دیتے رہیں انشاء اللہ پاکستانی عوام الناس پھر کہیں جا کر ایک نمایاں اور علیحدہ قوم ہونے کا دعویٰ کر سکیں گے۔ ''راہ رواں'' کے صفحہ 336 پر خود اقرار کرتی ہیں کہ اشفاق احمد خان پوری طرح ہندو مائتھالوجی کو سمجھ کر اس سے Disilllusion ہو گئے تھے کہ یہ دھوکہ دہی سے بھری ہوئی ہے۔ پھر تا عمر بانو قدسیہ خود اور اشفاق احمد اسی ہندو مائتھالوجی سے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لیکر پورے افسانے اور نصیحتیں گھڑتے رہے۔

صفحہ 337 پر لکھتی ہیں:

> ''لیکن اس سے بھی زیادہ کوفت انہیں پاکستان میں ساٹھ سال گزار کر ملی۔ انہیں آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ مسلمان بھی اونچ نیچ کا شکار ہیں۔ سید، پٹھان، جاٹ اور دیگر ذاتیں مٹھی بند مقبض ہیں اور کسی طرح آپس میں مدغم ہونے کو تیار نہیں۔ جس اخوت، بھائی چارے، مساوات کا خواب وہ دیکھ رہے تھے، اُس کو دھچکا لگا۔ یہ غالباً انسان کی تقدیر ہے کہ آدرشوں کو ہمیشہ کے لئے اپنا نہیں سکتا۔ اپنی نیت کے ہاتھوں ہوتا ہے سوچ کی سرحدوں میں آر پار جانے پر مجبور ہے۔''

آپ توجہ فرمایئے ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ کیونکہ ان میاں بیوی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ان کی اپنی عمر میں سب ٹھیک ہو جائے گا اس لیے یہ رجعت پسند طاقت کا ساتھ دیتے رہے۔ ذہنی طور پر سٹیٹس کو کو برقرار رکھنے کے جتن میں زود نویس بن گئے۔ کبھی

ادراک نہ کر سکے کہ ہمیں حق سچ کا ساتھ دینا ہے۔ عوام الناس سے لیکر خواص وحکمرانوں تک نئی صبح کی نوید سنانی ہے۔ ماضی کو دفنا کر افق پر جدیدیت کی تصویر کشی کرنی ہے۔ پیش آمدہ ملکی وغیر ملکی مسائل کے لیے کمر کسنے کا درس دینا ہے۔ اپنے گریڈ اور آمدن بڑھانے کے لیے وطن سے محبت کا نعرہ تو لگاتے رہے مگر ماضی پرستی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تبھی تو ساٹھ سال بعد disillusioned ہو کر اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔ کیوں نہ عوام کو شعور دے سکے کہ بانو قدسیہ نے جس ڈکٹیٹر ایوب خان کو درویش قرار دیا وہ ملک کو ایک اور نا اہل ڈکٹیٹر کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اور اس ڈکٹیٹر کے خلاف عدالت میں جائیں اور انہوں نے جو لوٹ مار کی اسے واگزار کروائیں پھر تیسرے ڈکٹیٹر کے فضائی حادثے میں جاں بحق ہو جانے کے بعد ان کے بیٹوں سے ان کی طرف سے چھوڑی ہوئی بے پناہ دولت کا تلقین شاہ ہی بن کر پوچھ لیتے۔ شکر ہے اردو سائنس بورڈ کی چیئرمین شپ کو موروثی قرار نہ دے گئے۔ جب وزیرِ اعظم بینظیر بھٹو نے انہیں اس عہدے سے فارغ کیا تو دو سال بعد جس ہستی کی سفارش لے کر گئے اس سے ان کی اس عہدہ سے محبت کا جنون کی حد تک اظہار ہوتا ہے۔ 1977ء کے مارشل لاء کے بعد سے لیکر اپنی وفات 2004ء تک کے عہد میں اپنے سماج کے تار و پود کو بکھرتے دیکھنا اور اپنے آدرشوں کو آنکھوں کے سامنے ٹوٹتے ہوئے دیکھنا ان کا مقدر ٹھہرا اور اسی دکھ کے ساتھ اگلے جہان عازمِ سفر ہوئے۔ اللہ جنت میں بلند درجات عطا فرمائے آمین۔

اب ہم ان کے افسانوں کا مجموعہ ''دست بستہ'' دیکھتے ہیں۔ اس میں بانو قدسیہ نے خاکہ نما افسانے لکھے ہیں اور دو تو باقاعدہ خاکے ہیں۔ ''مفتی جی خیمہ ساز'' ممتاز مفتی کے متعلق کمال لکھا ہے۔ ''مرزا بے تکلف بیگ'' اچھا خاصہ مزاحیہ خاکہ ہے۔ جبکہ ''ڈاہڈے سنگ پریت'' روایتی سا افسانہ ہے بس کہانی ایسی ہے کہ ایک اچھے بھلے آدمی کو فقیر ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ فُقر فقیری جو کہ پنجابیوں یا پھر سارے کے سارے

ہندوستانیوں کی روح میں رچی بسی ہوئی ہے لیکن اس افسانے میں ایک اچھے خاصے سمجھدار اور خوبصورت بیوی رکھنے والے نوجوان کا یکدم قبرستان میں جا کر فقیر ہو جانا سمجھ سے باہر ہو جاتا ہے۔ جب معاشرتی سمجھ بوجھ معلق ہو جاتی ہے، راہِ عمل مسدود نظر آتی ہے تو پھر کوئی فقیر، سادھو سنت یا کسی قبرستان کا تکیہ خودکشی کا بہترین مترادف بن جاتے ہیں۔ ''شکرانہ'' میں ایک آزردہ دل بوڑھے شاہ جی کا مایوس کن خاتمہ دکھایا گیا ہے۔

ان کے افسانوں کے مجموعہ ''امر بیل'' میں افسانہ'' ہو نقش اگر باطل'' لاجواب ہے۔مگر میں نے بانو قدسیہ محترمہ کے ساتھ پچھلے دو ماہ میں اتنا سفر کر لیا ہے کہ انہیں تقسیم سے پہلے دھرمسالہ سے لیکر 121 سی ۔ ماڈل ٹاؤن، داستان سرائے تک ان کے بچپن، الھڑپن، جوانی، اشفاق احمد خان سے محبت اور پھر سمن آباد میں 16 دسمبر 1956ء میں شادی اور خاص بات بانو قدسیہ محترمہ کے دماغ میں بسا خوف جس کا وہ برملا اظہار ''مردِ ابریشم'' اور ''راہ رواں'' میں کرتی ہیں ۔۔۔۔نہیں سمجھ سکا۔ اشفاق احمد خان نے انہیں انمول محبت دی، اعتماد دیا اور مصنف بنایا۔ ہمیشہ ان کو قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی جیسی بلند ادبی شخصیات کی معاونت رہی۔ پھر کس چیز کا خوف؟ کس بات کا خوف؟ ایک بات کانٹے کی طرح دل میں چبھتی ہے اور وہ یہ کہ بانو قدسیہ محترمہ نے کسی بھی جگہ اپنے والدِ گرامی کا نام ہی نہیں لکھا بلکہ ذکر تک نہیں کیا۔ وہ کیا کرتے تھے، کب وفات ہوئی وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔شاید ان کا نام نہ بتانے کا خوف؟ شاید۔۔ اشفاق احمد خان کو اپنے خاندان سے باہر شادی کرنے سے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔ اس کا خوف؟ قارئین! یقین مانیے بانو قدسیہ محترمہ نے یہ افسانہ خاص الخاص اپنی ازدواجی relationship میں خوف کی ایسی مبہم لکیر پر لکھا ہے جس کی بہترین تشریح وہ خود ہی کر سکتی ہیں۔ بہر حال یہ افسانہ میاں بیوی اور دوسری عورت کے ان کے ازدواجی دائرہ میں

داخل ہونے پر گہری نفسیات کا عکاس ہے۔ اسی مجموعہ ''امر بیل'' میں ان کا سب سے بہتر افسانہ امر بیل ہی ہے۔ جس پر میں اپنی رائے پچھلے صفحات میں گزار آیا ہوں۔ ''کتنے سو سال'' اشفاق احمد خان کے آدرش پر لکھا ہوا اور افسانہ ہے۔

بانو قدسیہ محترمہ، اشفاق احمد خان، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور ابنِ انشاء کی وہ ادبی ٹولی ہے جس پر بہت زیادہ تنقید لکھی گئی۔ ان تنقید کی کتابوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے نیم دلانہ تحقیق کے تحت محض بُغض اور کرودھ کا اظہار کیا گیا ہو۔ قدرت کی طرف سے بانو قدسیہ محترمہ اور اشفاق احمد خان کی جوڑی ایک مثال ہے پھر جس کی مثال مدتوں تک نہ مل سکے گی۔ یہ منجھے ہوئے اور ایک واضح سوچ کے حامل میاں بیوی تھے۔ انہیں ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب کیا سکھاتے۔ وہ خود اتنے زیرک تھے کہ داستان سرائے میں آنے والے ہزاروں لوگوں کو ہمدردی کا ہارپون مار کر نیم بسمل کر کے، اندر کی باتیں منہ سے اگلوا کے سینکڑوں کہانیاں لکھ سکتے تھے۔ دوستی اور پھر خاندانی دوستیاں پروان چڑھنا انسانی معاشرت کے اوصاف میں سے ایک وصف ہے۔ بانو۔۔اشفاق، شہاب فیملی اور ممتاز مفتی میں دوستی اگر بہت زیادہ بڑھ گئی تھی تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں لگتی۔ قدرت اللہ شہاب ایک سینئر بیوروکریٹ تھے، ان کی دوستی سے جہاں اپنے پرائے مستفید ہوئے تو ان قریبی تعلق داروں کا قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے کوئی مادی فائدہ اٹھانا بھی رواجی نظر آتا ہے۔ پتہ نہیں کچھ لوگ قدرت اللہ اور مفتی کے مقابلہ میں بانو۔۔اشفاق احمد کا ادبی قد بت کیوں کم تر جان لیتے ہیں۔ ہمیں ان بزرگ اور مرحوم ہستیوں کی سوچ، فلسفہء زندگی اور آدرشوں پر تو اپنی اپنی سمجھ کے مطابق تنقید کا حق ہے مگر ان کی ذاتوں کو کسی اور طرح سے malign کرنے کا حق ہرگز نہیں پہنچتا۔ اب اگر دوستوں کا حلقہ معروف ادیبوں پر مشتمل ہو (جو کے ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا اور نصیب والوں کو ہی میسر آتا ہے۔) تو ان سے ادبی مشاورت بھی کوئی گناہ نہیں ہوسکتا۔

بانو قدسیہ محترمہ نے قدرت اللہ شہاب کی وفات کے بعد ان کی یاد میں ایک مختصر سوانحی خاکہ لکھا (مردِ ابریشم)۔ اور میں سمجھتا ہوں جس طرح حق ادا ہونا چاہیے تھا وہ حق ادا نہیں ہوا۔ بانو قدسیہ محترمہ بطور ایک دفاعی کھلاڑی لگاتار دفاعی انداز میں اپنی اور قدرت اللہ کی relationship کو بیان کرتی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا ہمدردی کا ہارپون دلوں میں ایسا ترازو ہوتا تھا کہ ہارپون کے شکار کو پھر ان کے بغیر شب و روز کاٹنے مشکل ہو جاتے تھے (مردِ ابریشم۔ صفحہ 82) لیکن قدرت اللہ شہاب وہ مست الست صوفی تھا جس نے بانو کے ہارپون کو اپنے دل کا رستہ ہی نہ دیکھنے دیا۔ اس پوری کتاب کو پڑھ کر ایک باریک بین قاری یہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جب مصنف ایک خاص خوف اور بے یقینی کی زندگی گزار رہا ہو تو اس سے رہنمائی یا مضبوط بنیادوں پر استوار فلسفہ حیات دیا ہی نہیں جا سکتا۔ بانو محترمہ کی زیادہ تر تحریروں میں یاسیت، محبت کی سزا! موت یا مستقل حزن و ملال کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ انہوں نے اپنی عمر بھر کی تشکیک کو راجہ گدھ میں عروج پر پہنچا دیا۔ یہ محبّ و محبوب میاں بیوی انسانوں کے لیے سونے کا دل رکھتے تھے۔ ہر بابے، جوگی، سادھو سنت سے آس لگا لینا ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ خیر اور امن کی توقع اور اپنے آدرشوں کے حقیقت ہونے کی آس میں اندھا دھند ڈکٹیٹروں تک کی تعریفیں کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ ان کی ایوب خان کی پوجا بیکار گئی۔ جنرل ضیاء کی پوجا بھی بیکار گئی۔ ایسی صورت میں قدرت اللہ شہاب جیسے انسان سے دوستی جو وقت کے ساتھ ساتھ پیر و مرشد والے رشتہ میں ڈھلتی چلی گئی، کوئی عجیب بات نہیں لگتی۔ بانو۔ اشفاق نے ہمیشہ مفتی کی دبنگ جھڑکیاں اور غصہ اگر خندہ پیشانی سے سہا تو شہاب کی پراسرار وجدانی شخصیت سے فائدہ لینا بھی انہی کا حق بنتا تھا۔ بانو قدسیہ محترمہ نے اپنے تئیں قدرت اللہ شہاب کی یادداشتوں سے انصاف کرنے کی کوشش کی مگر تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے بیٹے ثاقب شہاب کو وہ یک دم نظر انداز کر

گئیں۔ ہمیں علم نہیں ہوتا کہ وہ اب کیا ہیں اور کہاں ہیں۔ بانو قدسیہ محترمہ خاموشی سے ایک تیر سے چار شکار کرتی نظر آتی ہیں۔ خاموشی سے اشفاق احمد خان کا اچھا خاصہ خاکہ لکھ ڈالا اور قدرت اللہ شہاب سے نسبت قائم کر کے خاموشی سے اپنے تینوں بیٹوں پر مختصر خاکے لکھ گئی ہیں۔ البتہ کتاب میں اشفاق احمد خان کی طرف سے قدرت اللہ شہاب پر لکھا گیا مضمون جو انہوں نے پشاور کی کسی تقریب میں پڑھا تھا ایک لاجواب اور خاصے کی چیز ہے۔ رومانوی انداز میں اپنی اور شہاب کی دوستی جو زیادہ تر ناخن کاٹنے تک گھومتی ہے بیان کی ہے۔ یہ مضمون اردو ادب میں یادگار رہے گا۔ میں نے ''راہ رواں'' میں اشفاق احمد خان پر بعد از مرگ لکھے مضمون بھی پڑھے مگر کوئی انسان بھی اس انسان کی اس طرح سے شخصیت کے رنگ نہیں دکھا سکا جیسے اشفاق احمد خان نے شہاب کی وفات کے بعد دکھائے۔ وجہ یہی ہے کہ اشفاق احمد خان کے بعد کوئی دوسرا اشفاق ہوتا تو مرحوم اشفاق احمد خان کی لفظوں میں تصویر بناتا۔ قصہ کوتاہ! اس کتاب یعنی ''مردِ ابریشم'' میں قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کے جو پہلو سامنے آنے چاہیے تھے وہ سامنے نہیں لائے گئے بس قدرت اللہ شہاب کی جودوسخا، خاموشی سے لوگوں کے کام آتے رہنا اور بانو قدسیہ محترمہ کا باورچی خانہ میں بیٹھ کر آلو پوریاں کھاتے کھاتے اور اشفاق احمد خان سے باتیں کرتے کرتے مشرقی پاکستان جانے والے صحافیوں کی لسٹ بنانا تھوڑا عجیب لگتا ہے مگر یہاں بھی یہی خیال گزرتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب کا اشفاق احمد خان کی ذات پر بطور محبِ وطن بہت بڑا اعتبار تھا۔ پھر ان دونوں میاں بیوی نے اسے ایک روحانی بابے کا روپ دے کر تقدیس کا جو پردہ چڑھایا ہے اس کے پس پردہ کیا تھا وہ ان سے بیان نہ ہوسکتا ہوگا۔

اب مختصر بات ''راہ رواں'' پر۔ بانو قدسیہ محترمہ تین جناتی ادیبوں کے سہارے کے بغیر مشکل سے یہ کتاب لکھ پائی ہیں۔ کئی جگہ خیالات کی repetition ہے۔ ایک دو

جگہ ٹیکنیکل غلطیاں ہیں۔ مثلاً صفحہ 16 پر ''بابا جی کو گھر کا شوق تھا۔ ان کا خیال تھا اعلیٰ نسل بیوی، اعلیٰ نسل کتا، اعلیٰ pedigree کا گھوڑا، اعلیٰ نسل کے اشراف کی نشانی ہے۔''
اب یہاں لکھنا چاہیے تھا بیوی اعلیٰ حسب نسب کی، کتا اعلیٰ pedigree اور گھوڑا اعلیٰ نسل کا۔ خیر اس کتاب میں بانو قدسیہ محترمہ نے خان صاحب کے خاندان کی کئی پشتوں تک کا تعارف کرا دیا مگر اپنے متعلق صرف اپنی امّی اور پرویز بھائی عرف ریزی ماموں پر اکتفا کیا ہے جبکہ اپنے والد صاحب کا کہیں بھول کر بھی ذکر نہیں کیا۔ کیوں؟ علم نہیں کونسی مصلحت کے تحت؟۔ البتہ یہ کتاب بانو قدسیہ محترمہ کے فلسفہ حیات کو کھول کھول کر بیان کرتی ہے جس کے حوالہ جات میں راجہ گدھ کے تحت جا کر دوں گا۔ ایک بات ابھی سے نوٹ فرمالیں بانو قدسیہ محترمہ نے راجہ گدھ میں سب سے بڑا قضیہ رزق حلال و حرام کا کھڑا کیا تھا اور لفظ genetic بھی خوب استعمال کیا تھا۔ راجہ گدھ میں وجہ دیوانگی اور خودکشی کو اس جینیاتی تبدیلی یعنی genetic mutation کے ساتھ link کیا ہے جو رزق حرام کھانے سے پیدا ہوتی ہے مگر اس سوانح عمری کو لکھتے وقت تک وہ اپنی تھیوری کو پٹتے ہوئے دیکھ چکی تھیں اس لیے خود ہی اس کی نفی صفحہ 288 اور 289 میں یوں کرتی ہیں:

> '' آج کل کے مرد اور عورت بھی بچوں پر بہت زور لگاتے ہیں لیکن اس کی وجہ خوف ہے خوفِ خدا نہیں۔ ماں باپ بچے کو خدائی مہمان نہیں اپنی پروجیکشن سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا سارا زور بچے کی تعلیم پر رہتا ہے، اسی لیے بچے کی تربیت کو ثانوی حیثیت مل گئی ہے۔ یہ عہد دولت، دولت کے حصول اور دولت کے بل بوتے پر اپنی حیثیت منوانے کا ہے۔ جو کچھ اس خواہش کی آگ میں جھونکا جا سکے اس سے آج کا ماڈرن انسان دریغ نہیں کرتا۔

غریبی کا خوف معاشرے کا وارث بن کر پھیلتا ہے تو پھر ایک دوسرے کے حالات سے سرد مہری بن کر ابھرتا ہے۔ خوف فرد کی سطح پر اور معاشرے کے مجموعی مزاج کے اعتبار سے رزق حرام کی یا پھر خودکشی یا خودکش حملے کی وبائی صورت اختیار کر لیتا ہے''۔

لیجئے جناب! غور کیجیے اب رزقِ حرام افرادِ معاشرہ میں خوف اور عدم تحفظ کی وجہ سے کمایا جاتا ہے۔ جو کہ بالکل فطری ہے لیکن راجہ گدھ میں رزقِ حرام اس وجہ سے کمانے کا ذکر کہیں موجود نہیں ہے۔ انہوں نے مندرجہ بالا پیراگراف میں غربت اور غربت کے خوف کو بالکل درست انداز میں سمجھا اور بیان کیا ہے۔ اب صفحہ 320 پر ملاحظہ فرمایئے:

''جتنے فرد اتنے راستے، جس قدر لوگ اتنی ہی رنگا رنگی۔ زندگی کے کارزار میں کچھ خوش نصیب شہید ہونے پر راضی، کچھ غازی بن کر لوٹنے پر شاداں و فرحاں، کچھ اپنے نفع و نقصان کے عادی مالِ غنیمت سمیٹنے والے، کچھ مرنے والوں پر بین صورت منڈلانے والے، کچھ راضی برضا، کچھ طوعاً و کرھاً دوسروں کے ساتھ چلنے پر آمادہ۔۔۔ غرضیکہ پاکستان میں ایک سیلاب کی صورت لوگوں کا ہجوم اپنی اپنی آرزوؤں کی چابک تلے دوڑ رہا تھا۔ اس دوڑ میں گھروں کے قفل ٹوٹے، الاٹ منٹ سسٹم کی ژولیدہ سری ابھری، نفسا نفسی کا آئین بھی لاگو ہو گیا''۔

مندرجہ بالا پیراگراف کو پڑھ کر یوں لگتا ہے ہندوستان سے چند لوگ ہی راضی برضاء ہجرت کر کے آئے باقی سب موقع پرست اور کمینے سفلے اٹھ بھاگے یعنی جن کی genetic chemistry پہلے سے ہی خراب تھی۔

اب صفحہ 321 پر ملاحظہ فرمائیے:

"کچھ سیانے سوچ بچار کا ایندھن جلا کر برصغیر کے بنیادی مسئلے کو سمجھنے میں گم تھے۔ ان میں ایک اشفاق احمد خان بھی تھے۔ جن کا رویہ، سوچ اور عمل تینوں مثبت تھے۔ وہ دوسروں کو سمجھانا جان گئے تھے۔"

اب غور طلب بات ہے کہ بٹوارے کے بعد بھی برصغیر کا مسئلہ کیا تھا؟ اور اشفاق احمد خان صاحب دوسروں کو کیا سمجھاتے رہے تھے جبکہ وہ 1947ء کے فوراً بعد والٹن کیمپ لاہور بغرض نوکری گئے اور 60 روپے ماہوار نوکری حاصل کر کے مہاجرین کی آباد کاری پر لگ گئے۔ وہیں پر ان کی دوستی ممتاز مفتی سے ہوئی (بحوالہ راہِ رواں)۔ پھر 60 سال تک عوام کو کیا سمجھاتے رہے۔۔۔ جس کے بعد بھی ملک سیدھی راہ پر نہیں چل سکا بلکہ آج قعر مذلت میں نیچے گرتا چلا جا رہا ہے۔ اشفاق احمد خان صاحب نے کیا راز پا لیا تھا جو 60 سال سمجھاتے سمجھاتے یہاں تک لے آئے۔

جناب اشفاق احمد خان صاحب نے بقول بانو قدسیہ محترمہ سمجھانا جان کر بھی کچھ نہ سمجھا پائے حالانکہ آپ اردو سائنس بورڈ کے مدت مدیر چیئر مین رہے۔ مالی طور پر اللہ کا فضل سمیٹنے کے لیے بابوں کے ڈیروں سے لیکر ایوان حکومت تک، ریڈیو سے لیکر T.V تک لگاتار مشقت میں مصروف رہے۔ آپ سمجھا سکنے کی صلاحیت رکھتے ہوتے تو ایک انقلابی کام کر کے ہمیشہ محسن قوم کا درجہ اختیار کر جاتے۔۔۔ بھلا کیسے؟ ابتدائی دنوں سے بابوں کی دعاؤں سے ایوانِ اقتدار میں بیٹھے لوگوں سے ملک میں میڈیم آف ایجوکیشن اردو میں کروا جاتے۔ تصور کیجئے آج ملک میں جو تعلیمی معجونِ مرکب تیار ہو چکی ہے وہ سماجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اشفاق احمد خان اتنا کچھ سمجھا کر اور تلقین کر کے بھی کچھ بھی خاص نہ کر سکے۔

راجہ گدھ لکھنے کے تقریباً 35 سال بعد انہیں احساس ہوا ہے کہ معاشرتی بگاڑ کی رزق حرام ہی نہیں کچھ اور بھی وجوہات ہوتی ہیں۔ مگر بڑی دیر کر دی مہرباں آتے آتے۔ ملاحظہ ہو صفحہ 321:

''اگر فرد یا گروہ اس فریب میں مبتلا ہو کہ وہ کسی سے ارفع یا اعلیٰ ہے تو وہاں انصاف کا آدرش پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔''

صفحہ 321 پر ہی ملاحظہ کیجیے:

''اسلام میں جو بنیادی اہمیت نیت کی ہے وہ اسی رکاوٹ کو عبور کرنے کے لیے پیش کی گئی۔ ایک طرف نیت، دوسری طرف معاشرے میں برابری اور تیسری طرف رزقِ حلال ایسے معیاری مشکل اصول ہیں جنہوں نے اسلامی معاشرے میں انصاف کو روح رواں بننے نہیں دیا۔''

صفحہ 322 تو آپ کے فلسفہ حیات پر پڑھنے کے لائق ہے۔ آپ محترمہ نے کسی پہلو کو نہیں بخشا اور حل بھی دیا ہے مگر شاید نیتاً نہیں۔

''اس معاملے میں مغرب والے ہم لوگوں سے سبقت لے گئے۔ وہاں گروہی شناخت اور فرد کی اہمیت کسی خاص Ethnic Group، ذات، نسل، قبیلے کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ رنگ کا مسئلہ انہیں درپیش تو ضرور ہے لیکن بظاہر برادری اور ہمواری نے انصاف اور قانون کا احترام آسان کر دیا اور سچ بولنے اور حق دینے میں کچھ ایسی دشواری پیش نہیں آتی۔''

''حملہ آور ویسے بھی فاتح کہلوانے کے لیے دشوار گزار راستوں سے آئے تھے۔ وہ چاہے سکندرِ اعظم جیسا انسان دوست ہو یا محمود

غزنوی اور نادر شاہ کے روپ میں ہلا کو بن کر تہس نہس کرنے آیا ہو۔ وہ مقامی لوگوں میں ظلم کی کہانیاں تو پھیلا گیا، لیکن انصاف کے لیے بلکتی رعایا کو کوئی علاج نہ پیش کر سکا۔

پنجاب کی سر زمین میں حملہ آوروں کے ساتھ ساتھ اور کبھی کبھی دور دراز سے علی ہجویری داتا گنج بخشؒ جیسے صوفی لبیک پکارتے اس مقام پر آ نکلے جسے لاہور کہتے ہیں۔ بادشاہوں، حملہ آوروں، اونچی جاتی کے مہا پُرشوں کے ستائے عوام مرہم کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ ان ڈیروں میں پناہ گزیں ہونے لگے، جہاں مفت روٹی ملتی تھی اور دکھڑا سنانے کو ایک رحم دل بابا ملتا تھا۔

لیکن سچ کا راستہ پھر مسدود ہونے لگا۔ لوگ دنیا کے ستائے ہوئے ڈیرے پر آتے تھے، لیکن انہیں نہ خدا کی تلاش تھی، نہ معرفت حق۔ صوفی کے پاس دینے کو دنیا نہ تھی۔ وہ تو خود بہت کچھ تیاگ کے، دنیا کی راحتوں سے منہ موڑ کر خلق کو خواہشات کے چنگل سے نکالنے کا خواب دیکھتا آیا تھا۔

مہاتما بدھ سے لے کر ماڈرن عہد تک یہی کچھ سکھانے کے لئے کچھ اللہ کے لوگ گھروں سے نکلتے تھے، لیکن جو کچھ صوفی ایک غریب کے کاسے میں ڈال رہا تھا، اس کی حاجت مند کو ضرورت نہ تھی۔ اس طرح عوام اور پیر کے درمیان مریدین اور خلیفہ حضرات کی دروغ گوئی کا ایک انوکھا سلسلہ چل نکلا اور غریب کو پھر صرف احساسِ کمتری ملا، بدقسمتی سے انصاف نہ مل پایا۔

سچ کو خوشامد کی خوبصورت چادر اوڑھا کر دیا گیا۔ لمبے لمبے نسب

نامے عرب کے مقتدر قبیلوں سے ملائے جانے لگے۔ شجرہ لکھنے اور پڑھنے کا رواج ہوا۔ عام آدمی ایک بار پھر اتنی شان وشوکت کے سامنے ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے بھی اپنے اردگرد جھوٹ کے شامیانے گاڑھ لیے اور ان میں استراحت کرنے لگا۔ اپنی چوری سینہ زوری کے لیے دہشت گردی، عزت کی خاطر مر مٹنے یا مار ڈالنے کا جواز اس نے مذہب اور رسم ورواج میں تلاش کر لیا۔

اس طرح مشرق میں انصاف اور قانون کا تصور باقی رہا لیکن اضافی شکل میں اس پر عمل مفقود تھا۔ مغربی لوگ ذات پات کے سوالوں میں کبھی رہے نہ تھے۔ انہیں حملہ آوروں سے بھی اتنا پالا نہ تھا۔ انہیں مختلف رنگوں سے بھی نپٹنے کی ضرورت نہ تھی۔ گورا، گندمی، گندم گوں، پیازی، سانولا، کالا ایسے الفاظ ان کی لغت میں نہ تھے۔ قدرت نے انہیں اس معاملے میں برابری عطا کر کے بڑی سہولت پیدا کر دی تھی۔''

صفحہ 322 کے بعد ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بانو محترمہ کے 1981ء کے بعد معاشرے میں وجہ فساد اور انسانوں میں دیوانگی اور خودکشی کے رجحان کے پروان چڑھنے کی رزقِ حرام سے بھی زیادہ معاشرتی ناہمواری، بے انصافی اور واضح راہِ عمل کی عدم موجودگی جیسی وجوہات ہوتی ہیں۔ لہٰذا راجہ گدھ کا سارے کا سارا فکری ڈھانچہ اپنے آپ مر جاتا ہے اور اب اس کا یونیورسٹیوں میں بطور مثالی ناول پڑھایا جانا اپنا اخلاقی جواز ختم کر دیتا ہے۔

صفحہ 321 کے اقتباس میں ایسا نقطہ بیان کیا جو پھر قاری کی سمجھ سے بالا ہے یعنی تانگے کو گھوڑے کے آگے جوڑنے کی کوشش کی ہے نہ کہ گھوڑے کو تانگے کے آگے۔

معاشرہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی جب کسی بھی معاشرہ میں عدالتی انصاف بکنے لگ جاتا ہے تو رزق حرام کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور جب عدالتی انصاف قائم ہو جاتا ہے تو پھر رزق حرام کا قضیہ بھی مِٹ جاتا ہے لیکن بانو قدسیہ محترمہ نے ٹھیک اگلے پیراگراف میں مغربی معاشرہ کی مثال دیتے ہوئے گھوڑا انگریزی تانگے کے آگے جوڑ کر بات سمجھا دی ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے:

''اس معاملے میں مغرب والے ہم لوگوں پر سبقت لے گئے ہیں۔ وہاں گروہی شناخت اور فرد کی اہمیت کسی خاص ethnic group، ذات، نسل، قبیلے کی مرہون منت نہیں۔ رنگ کا مسئلہ انہیں درپیش تو ضرور ہے لیکن بظاہر برادری اور ہمواری نے انصاف اور قانون کا احترام آسان کر دیا ہے اور سچ بولنے اور حق دینے میں کچھ ایسی دشواری پیش نہیں آتی۔''

آپا بانو قدسیہ محترمہ کے راجہ گدھ کی ساری عمارت انھی کے ہاتھوں زمین بوس ہوتی نظر آتی ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے صفحہ 323 ''راہ رواں'':

''مغرب میں انسان کی شناخت کے لیے دو چیزیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ یا تو انسان کے آداب (manners) اس کی پہچان ہیں یا اس کا کام اور سوسائٹی کا عطا کردہ مقام اس کے I.D کارڈ میں شمار ہوتا ہے۔ اتنی برابری سے ان میں ایک بہت بڑی خوبی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قانون کے پابند رہتے ہیں۔ ان کے لئے بار بار آئین تبدیل نہیں ہوتا اور انصاف جو اسلام کا روح رواں ہے، ان کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور ان کے معاشرے کی پہچان بن جاتا ہے۔''

لیجیے اگر بانو قدسیہ محترمہ اور مرحوم اشفاق احمد خان تا عمر ہر حکمران کو یہ بات ہی سمجھاتے رہتے کہ جناب اپنی عدلیہ کو آزاد قوت فیصلہ عطا کر دیجیے ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔ رزق حرام کمانے پر کنفیوشس نے تقریباً 2000 قبل مسیح چینی بادشاہوں کو ہدایت نامہ لکھ کر دیا تھا کہ راشی عُمالِ حکومت کو نہ صرف سزائے موت دو بلکہ اس کے اہلِ خانہ کو بھی موت کی سزا دو تو حکومت درست چلتی رہے گی۔ چین میں آج تک اس قانون کی عملداری ہے دیکھ لیجیے ترقی کا عالم کیا ہے۔

میری راجہ گدھ کے فلسفہ حرام حلال پر اسلامی نقطہ نگاہ سے بحث متعلقہ ابواب میں آئے گی فی الحال اتنا ہی ہے کہ بانو محترمہ کی ''راہ رواں'' اپنے خاوند کے آدرشوں سے تعارف پر کم اور بانو محترمہ کے ذاتی فلسفہ اور بے جا طور پر اشفاق کے خاندان کے تعارف پر زیادہ ہے اور اپنے والد کا نام اور پس منظر ایک بھی جگہ نہیں دیا۔ البتہ وکی پیڈیا پر میں نے مثال کے چار مشہور ہستیوں کے نام بمعہ ولدیت پوچھے تو تین کے نام کے ساتھ باپوں کے نام آ گئے لیکن بانو قدسیہ کے والدِ محترم کے نام کا خانہ وہاں بھی خالی ہی ملا۔ قصہ کوتاہ! یہ کتاب صاف ظاہر کرتی ہے کہ ایک بھی مردمیدان زندہ نہ رہا جو ان کی تحریروں کی کتر بیونت کر کے انہیں لافانی بنایا کرتا تھا۔

خود پڑھیے اور فیصلہ کیجیے۔

O

باب 2

عنوان بے عنوان غلط عنوان

سبھی صاحب شعور ادیب جانتے ہیں کہ کسی بھی ادب پارے کا نام یا عنوان اس ادب پارے کا مکھڑا ہوتا ہے۔ کتابوں کی دکان پر آپ شیلفوں اور شوکیسز میں سجی کتابوں کے عنوان یا ٹائٹل سب سے پہلے پڑھتے ہیں اور بعض اوقات آپ کسی بھی کتاب کے ٹائٹل کی خوبصورتی اور نام سے متاثر ہو کر ہی کتاب خرید لیتے ہیں۔ ذہین لوگ عنوان کے معنی سے کسی حد تک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ اندرونی صفحات میں کہانی کیا ہو گی۔

اردو ادب میں ''آگ کا دریا''، ''امراؤ جان ادا''، ''قِصہ چہار درویش''، ''اداس نسلیں''، ''خدا کی بستی''، ''جانگلوس''، ''شہر بے مثال'' یا ''پریشر ککر'' وغیرہ وہ ناول ہیں جن کے نام فوری توجہ کھینچتے ہیں اور پھر اندر کہانی بھی اپنے اپنے عنوان کے مطابق لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ''راجہ گدھ'' زبردست کشش پیدا کرنے والا عنوان ہے اور پھر بانو قدسیہ محترمہ کے چھوٹے بھائی پرویز عرف ریزی نے بڑی محنت سے اس کا ٹائٹل ڈیزائن کیا جو بذاتِ خود اپنی شناخت قائم کر گیا۔

انسانی نفسیات کا ایک وصف ہے کہ بادشاہوں سے لیکر عام انسانوں تک اپنے ذاتی ناموں سے لیکر اپنے جانوروں تک، اپنے کاروباری ناموں سے لیکر اپنی گاڑیوں تک یا اور اشیاء تصرف کے لیے بھی ایک بامعنی نام تجویز کرتے آئے ہیں۔ اور پھر کوشش ہوتی ہے جس ادارہ یا پالتو جانور کو جو نام دے دیا جائے اس میں ویسے ہی محاسن

بھی پیدا ہو جائیں۔

یاد رہے کہ ماسوائے حضرت انسان کے تمام جاندار ایک مخصوص سرشت کے تحت ہی زندگی گزارتے ہیں۔ یہ انسانی دماغ کا ہی کرشمہ ہے کہ یہ کبھی شیر کی طرح دلیر۔ کبھی سانپ کی طرح خفیہ اور زہریلا۔ کبھی گدھے کی طرح بیوقوف۔ کبھی گائے کی طرح صابر۔ کبھی گھوڑے اور کتے کی طرح وفادار اور کبھی بھیڑیئے کی طرح مطلب پرست۔ کبھی گرگٹ کی طرح اپنے مزاج کے رنگ بدلنے والا بن جاتا ہے۔ دیکھا گیا کہ چور سے سادھ بن جانا۔ رحم دل سے ظالم ترین بن جانا بھی انسانی فطرت کے رنگ ہیں جیسے بابا بلھے شاہ فرما گئے۔ میرا ایہہ چرخہ نولکھا کڑے۔ جب تک سماج میں انسانی دماغ کی اُپج کو درست سمت میں قائم کرنے کی سنجیدہ کوشش اور خواہش نہ ہو گی۔۔۔ بے انصافی۔ رشوت۔ ظلم اور حق داروں کا حق غصب کرنے کا کلچر موجود رہے گا، نصیحت یا تلقین سے نہیں بلکہ قانون کی بالادستی سے انسان کو گرگ بننے سے روکا جا سکتا ہے۔ مُلکی intelligentia کی بلند شعوری کاوشوں اور حکومتی سطح پر ایمانداری اور تبدیلی کی خواہش سے ہی ایک فلاحی اسلامی معاشرت قائم ہو سکتی ہے۔

جب میں نے راجہ گدھ کے نام اور ناول کے اندر کہانی میں غور سے مطابقت دیکھنے کی کوشش کی تو کوئی بھی کردار گدھ جیسی خصوصیات و عادات و خصائل سے میل نہیں کھا رہا تھا۔ میری تحقیق مجھے اردو ڈکشنری تک لے گئی بعد ازاں انٹرنیٹ پر بھی explore کیا تو علم میں یہ آیا کہ گدھ پرندوں کی اس نسل سے ہے جو ماحول دوست یعنی environment friendly پرندے ہوتے ہیں۔ یہ کسی کو مار کر نہیں کھاتا بلکہ جانداروں کے مردہ اجسام جن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہ گئی ہو اور ان کی لاشیں گل سڑ کر اردگرد تعفن اور کوئی وبائی مرض پیدا کر سکتی ہوں، انہیں کھا کر ماحول کو صاف کر دیتا ہے۔ پوری دنیا میں orintholigists گدھ کو بچانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ خصوصاً

گرم خطوں میں اس کی کثیر تعداد ضروری ہے جہاں پر گرم مرطوب موسم کی وجہ سے مرداروں کی لاشوں سے وبائی امراض پھیلنے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ پوری فرہنگ آصفیہ میں گدھ کی تعریف موجود ہے مگر راجہ گدھ نام کی چیز کی وضاحت نہیں کی گئی۔ خیر ہم گدھ کو ہی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ گدھ کا زندہ اجسام کو شکار کرنا ہی اس کی سرشت کے خلاف ہے۔ اب جب اس کی سرشت کا ہم اس ناول کے تمام مردانہ کرداروں سے موازنہ کرتے ہیں تو کوئی بھی کردار اتنا شریف النفس اور معصوم نظر نہیں آتا کہ وہ گدھ جیسے اشرف اوصاف کا مالک ہو۔ ویسے بھی انسانی معاشرت میں انسانی مزاج اور کردار اپنے دستیاب معروض سے نمو پذیر ہوتے ہیں۔ نفسیاتی، سائنسی اور معاشرتی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کسی بچے کے genes اس کے کردار پر کوئی اثر نہیں رکھتے ماسوائے جسمانی ساخت کے البتہ یہ اس کا سماجی ماحول ہوتا ہے جو اس کے مابعد کے اعمال و افعال کی راہیں متعین کرتا ہے۔ یوں تو لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر یہاں قدیم عہد سے ایک مثال پر ہی اکتفا کروں گا۔

مثال یوں کہ اکبر اعظم کے دربار میں کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد اکیلے رکھ کر پرورش کی جائے تو جوان ہو کر وہ شاید بہترین انسان بن سکیں۔ لہٰذا آگرہ میں بستی سے ہٹ کر ایک گپت قسم کی عمارت تعمیر کی گئی اس کا نام گُنگ محل رکھا گیا۔ بعد ازاں مختلف علاقوں سے حکمِ شاہی کے تحت نوزائیدہ بچے لا لا کر گونگے بہرے مرد اور عورت خدمتگاروں کے سپرد کر دیئے گئے۔ کئی سال گزر جانے کے بعد بادشاہ اور وزرا وہاں کا منظر دیکھ کر کانپ گئے کیونکہ تمام بچے مخبوط الحواس گونگے بن چکے تھے۔ شاید جانوروں سے بھی بُرے۔ انہیں فوراً وہاں سے نکالنے کا حکم دیا گیا اور تواریخ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ اکبر کی وفات کے بعد بھی ان مخبوط الحواس بچوں میں سے کئی زندہ رہے اور آگرہ کی گلیوں میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھے گئے۔ ان میں سے ایک بھی اپنی

جینیاتی خصوصیات استعمال نہ کر سکا کیونکہ عقل وفہم کے کردار معاشرتی تربیت سے منسلک ہوتے ہیں۔

پھر آپ بارہویں صدی کے مسلم سپین میں ابن طفیل کو دیکھیں جنہوں نے شاید انسانی تاریخ کا پہلا ناول ''حیّ ابنِ یکذان'' لکھا۔ جس کا لُب لباب یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا انسانی بچہ صاف سلیٹ کی مانند ذہن لیکر پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ معاشرہ یا معروض ہی ہے جس کی بنیاد پر اس کی ذہنی اٹھان نمو پاتی ہے۔ ابنِ طفیل کے شاگردِ رشید مشہور مسلمان فلسفی ابنِ رُشد نے اسی بنیاد پر چند ایک فلسفیانہ خیالات دیے جنہوں نے بعد ازاں یورپ میں جدید نفسیاتی علوم کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

صاحبانِ عقل! یادر ہے genetic coding میں طبعی جسمانی خدوخال کا نقشہ ہوتا ہے نہ کہ والدین کی طرف سے رزقِ حلال یا حرام کا کوئی اثر۔ اگر جینیاتی کوڈ ایک نسل میں برابر و یکساں چل رہا ہو تو شکل وصورت سے لیکر معیارِ عقل بھی ایک والدین کی اولاد میں سو فیصد ایک جیسا نمودار ہو۔ مگر ایسا کبھی ہوتا دیکھا نہیں گیا۔ بچے کو جیسا ماحول ملتا ہے اس کی شخصیت ویسی ہی راہوں کا انتخاب کرتی ہے اور ویسے ہی سماجی رویوں کا اظہار کرتی ہے۔

رشوت کھانے کو یا غیر ازدواجی جسمانی تعلقات کو بانو قدسیہ محترمہ گدھ کے کردار سے مشابہت دیتی ہیں تو مکمل لاعلمی یا تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ پچھلے باب میں ''راہ رواں'' سے دیئے گئے حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ محترمہ کو راجہ گدھ لکھتے وقت اپنی جذباتیت اور علمی کوتاہی کا علم بہت دیر بعد ہوا کہ خوف اور ناانصافی کی وجہ سے افراد میں جو ذہنی رَو پروان چڑھتی ہے وہ انہیں رشوت کھانے پر مجبور کرتی ہے اور مزید شک یہ ہے کہ محترمہ نے ''راہ رواں'' میں دعوئٰ نہیں کیا کہ رشوت خوروں کی اولاد genetically mutate ہو جاتی ہے۔

اب ہم دوبارہ عنوان کی طرف آتے ہیں۔ راجہ گدھ کے تمام کردار ذی شعور اور آزاد مرضیوں کے مالک ہیں۔ گدھ کی طرح معصوم اور ماحول دوست نہیں کہ کوئی مرے اور اسے چٹ کر جائیں بلکہ اپنی اپنی جگہ اپنی آزاد مرضی کے تحت جو ذہنی اطمینان ملتا ہے اسے حاصل کرتے ہیں۔ وہ کوئی جانور نہیں جو ایک ہی لگی بندھی سرشت کے طابع ہوں۔

کرداروں کے ماحول اور انکی نفسیاتی تحلیل نفسی کے تحت ہم تدبر کرتے ہوئے تخیل کے عروج پر جاتے ہیں تو مندرجہ ذیل وضاحتیں سامنے آتی ہیں:۔

۱۔ یہ کہ رشوت خور کو اگر کوئی کراہت آمیز نام دینا ہی ہے تو گرگ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی superlative degree بنتی ہے گرگِ باراں۔ یعنی انتہائی چالاک اور منجھا ہوا بھیڑیا جو اب بارش وغیرہ سے بھی نہیں ڈرتا اور اپنا شکار کیے جاتا ہے۔ وہ راشی جو نہ قانون اور نہ معاشرتی ذلت کو خاطر میں لاتا ہے۔ جیسے کہ سیمی کا باپ۔

۲۔ یہ کہ جو انسان کسی پوزیشن میں نہیں بس اپنے سماجی تعلقات کی آڑ میں صورت حال کا فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ بھی گرگ سُرشت ہو گا نا کہ گدھ جیسے کہ قیوم۔

۳۔ یہ کہ جو انسان اپنے فرائض کو جانفشانی اور دیانتداری سے ادا کرنے کی بجائے محض اپنے گریڈ بہتر اور زندگی کی زیادہ سے زیادہ تعیّشات جمع کرنے میں لگ جاتا ہے اور وقتاً فوقتاً اپنی انا کی تسکین کے لیے انسانوں میں دروغ کے سہارے پھوٹ ڈلواتا ہے اسے بھی گرگ ہی کہیں گے یا گرگا کہیں گے کیونکہ ڈکشنری میں یہ انسانی کردار کے لیے ہی وضع کیا گیا لفظ ہے۔ یعنی بڑا بھاری مکار۔ سفلہ مقرب وغیرہ۔ جیسے کہ پروفیسر سہیل اور قیوم کا چچا غلام رسول۔

اتنی لمبی بحث اور دلائل کے بعد آپ پر واضح ہو گیا کہ اس ناول کی سٹوری لائن

میں دیے گئے کرداروں میں سے کوئی بھی گدھ سے مشابہت نہیں رکھتا جو کہ خدائی خاکروب ہے نہ کہ پلاننگ کر کے کمزوروں کو مارتا ہے بلکہ سبھی کے سبھی بنیادی مردانہ کردار گرگ، گرگِ باراں، گرگِ کُہن یا پھر گرگا ثابت ہو رہے ہیں۔ کوئی کردار بھی گند صاف کرنے والا ثابت نہیں ہوتا ہے بلکہ گند ڈالنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ میں ایک چھوٹے سے مذاق کی جسارت کرتا ہوں۔ معاف فرمایئے گا! گدھ جاتی کو کچھ بھی شعور ہوتا تو وہ یقیناً کسی اچھے وکیل کی خدمات حاصل کر کے ہائی کورٹ میں رِٹ کر دیتے اور استدعا کرتے کہ بانو قدسیہ محترمہ ہمارے اعلیٰ کردار کو گرگ صفت لوگوں سے نسبت دینا فوراً بند کر دیں اور ناول کا نام کرداروں کی ذہنی سوچ اور افعال کے مطابق کچھ اور رکھ لیں۔ ہمیں مفت میں بدنام نہ کریں۔

لیکن بانو قدسیہ محترمہ اقرار کرتی ہیں کہ وہ تیز طبیعت ہیں دیکھیے ''مردِ ابریشم'' اور ''راہ رواں''۔ جلد سوچتی اور فوراً عمل پیرا ہو جانے والی شخصیت ہیں۔ کہیں یہ نام ذہن میں آیا تو پھر پکا سما گیا۔ تدبر سے سوچا ہی نہ کہ گدھ کی سرشت انسانوں سے ہرگز میل نہیں کھاتی اور یہیں پر ان کے تین بہترین ادبی مشیر بھی مات کھا گئے۔ گدھ سے راجہ گدھ اختراع کیا اور پھر اس کی popularity پر اس قدر خوش ہوئیں کہ پکی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ راجہ گدھ خالصتاً ان کی اپنی پیدائش تھا اور کماؤ پوت بھی ثابت ہوا چنانچہ 2015ء میں اپنے 21 افسانوں کے مجموعے ''دوسرا دروازہ'' کا انتساب ہی راجہ گدھ کے نام کر دیا۔

○

باب 3

جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء اور راجہ گدھ کا ظہور

1977ء میں جنرل ضیاء الحق صاحب کے مارشل لاء سے جہاں ملک میں سیاسی تعطل پیدا ہوا وہیں پر پاکستانی intillectuallism میں بھی اڑچن پیدا ہوئی۔ بہت سارے روشن خیال ادیب اور شاعر ملک بدر ہو گئے۔ ملک میں رہ کر نعرہ حق برخلاف ضیاء الحق بلند کرنے والے ادباء اور شعراء، سیاسی کارکنوں اور خاص طور پر صحافیوں کو قید و بند حتیٰ کہ کوڑوں اور پھانسی تک کی سزائیں بھگتنا پڑیں۔ اس تناظر میں لاہور جیسے شہرِ بے مثال کی ادبی جوڑی کو دور کی سوجھی۔ چونکہ ملک کو اسلامائز کرنے کا حکومتی جنون عروج پکڑتا جا رہا تھا اس لیے ''گرگِ شب'' میں اکرام اللہ کی طرف سے دی گئی واضح تجاویز بابت معاشرتی تبدیلی کو پس پشت ڈالتے ہوئے بانو قدسیہ محترمہ نے اپنی روایتی ادبی سوچ سے ہٹ کر ایک سنجیدہ فلسفہ حیات پر سوچا اور رزقِ حرام (جو کہ اس وقت تک آبادی کا شاید اعشاریہ ایک فیصد سے بھی کم حصہ کھا رہا تھا) کی تھیوری پیش کی جس کے تحت ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رزقِ حرام کھانے والوں کی اگلی نسل میں genetic mutation ہو جاتی ہے جو وجہ دیوانگی بنتی ہے اور سماجی بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ اس سوچ کو بنیاد بناتے وقت محترمہ باقی تمام سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور تعلیمی حقائق کو نظر انداز کر گئیں۔ یکسر بھول گئیں کہ ملک میں غیر آئینی اور ظلم و جبر پر مبنی حکومت بذات خود

اجتماعی دیوانگی اور سماج میں کئی پہلوؤں کے بگاڑ کا لازمی سبب بنتی ہے۔ مثلاً ضیاء الحق صاحب غیر آئینی حکومت کے سبب عوام کو بتائے بغیر امریکی پٹھو بن کر جس افغان جنگ میں کود پڑے اس کے نتیجے میں منظم ہیروئن فروشی اور اسلحہ کی ترسیل بعد ازاں دہشت گردی کے جو تحائف پاکستان کو ملے آپ سب خوب آگاہ ہیں (دیکھئے ندیم فاروق پراچہ کی کتاب "End of Past")۔ اس وقت مزاحمتی ادب لکھنے کی بجائے تلقین شاہی ادب کا شاہکار راجہ گدھ لکھا گیا۔ اس ناول کے ردِ عمل میں بریگیڈیئر صدیق سالک نے روشن ضمیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر دباؤ کو پسِ پشت رکھتے ہوئے ''پریشر ککر'' لکھا۔ پھر بہت بعد میں عبداللہ حسین نے ''باگھ'' میں علامتی انداز میں معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کی طرف اشارے کیے۔ مگر سب سے بڑا علامتی افسانہ ''سیاہ آسمان'' پھر اکرام اللہ نے ہی لکھا۔ جو 1977ء میں رسالہ ''احتساب'' میں چھپا لیکن اس افسانے کی دوبارہ رونمائی 1992ء میں اکرام اللہ کے افسانوں کے مجموعہ ''بدلتے قالب'' میں ہوئی۔

سارے کا سارا افسانہ علامتی ہے۔ راجہ گدھ جیسے یاسیت، مایوسی، ذاتی اغراض و حرص، انسانی کمینگی، رزقِ حرام کی غلط تھیوری، ذاتی نظریہ پر مبنی بابا ازم اور اسلامی تعلیمات کی غلط تشریحات اور genetic theory پیش کرنے والے ناول کے برعکس اکرام اللہ کا مختصر افسانہ ''سیاہ آسمان'' آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ پڑھیے اور فیصلہ کیجیے کہ اس دورِ آشوب میں راجہ گدھ لکھا جانا چاہیے تھا یا پھر جناب اکرام اللہ جیسے بہادر انسان کی سوچ کو بطور معاشرتی و سماجی آئین بڑھاوا دیا جانا چاہیے تھا تاکہ عوام درست سمت میں شعوری تربیت لے کر ظالم کے پنجہ استبداد کو توڑ دیتے۔ ان کا مختصر علامتی افسانہ ذیل میں حاضرِ خدمت ہے۔

''سیاہ آسمان''

اندھیری سیڑھیاں پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کے چڑھتے چڑھتے دم پھول گیا تو سانس بحال کرنے کے لیے دیوار کا سہارا لے کر رک گیا۔ اور ہاتھ یونہی غیرارادی طور پر سر کے اردگرد کسے لوہے کے کڑے کو چھونے لگا۔ میں اسی بلڈنگ میں باقس کے فلیٹ پر پہلے ہزار مرتبہ آچکا ہوں مگر پہلے نہ تو سیڑھیاں کبھی اتنی اندھیری پائیں اور نہ اس قدرلق و دق خالی۔ یوں ہوا کرتا تھا کہ یہی کوئی بیس پچیس سیڑھیاں چڑھے، ایک گیلری سی میں سے گزرے اور سامنے اس کے فلیٹ کا روشن دروازہ کھلا ہوتا تھا۔ آج اب تک اغلباً کوئی دوسو سیڑھیاں تو چڑھ چکا ہوں گا مگر نہ وہ گیلری آئی نہ کہیں کوئی روشن دروازہ نظر پڑا۔ اس بلڈنگ میں اتنے بہت سے آباد فلیٹ ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ آج نہ کوئی اوپر جا رہا ہے اور نہ نیچے آرہا ہے۔ کیا یہ وہی بلڈنگ ہے؟ بلڈنگ تو بہر حال وہی ہے۔ تو پھر اس کے باسی نقل مکانی کر کے کہیں چلے گئے ہوں گے۔ باقی باسی تو خیر فانی انسان ہیں کسی خطرے کی بوسونگھ کر بھاگ لئے ہوں گے۔ مگر باقس تو ایک دیوتا ہے، امر، ازلی، ابدی اسے ان خطروں سے کیا خوف۔ وہ جب چاہے ایک لحظے میں سورگ نکل جائے اور جب چاہے لوک میں لوٹ آئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے فلیٹ تک جانے والی سیڑھیاں آج یک دم یوں لمبی کھنچ گئی ہیں جیسے ربڑ کا غبارہ۔ پہلے تو محض ایک ذرا سا چھچھڑا ہوتا ہے۔ جب کوئی بچہ اس میں ہوا بھرنا شروع کرتا ہے تو حیران کن حد تک لمبا ہوتا چلا جاتا ہے۔

ان سیڑھیوں پہ ضرور کسی نے ایسا ہی کوئی عمل کیا ہے۔ اب وہ طفل نادان معمول کے مطابق دوہرا ہو ہو کر زور لگاتا ہوا اس میں اپنی گندی سانس ٹھونستا جائے گا حتیٰ کہ غبارہ بھک سے اڑ جائے گا اور یہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔ میں اس اندھیرے اور تنہائی میں یوں کھڑا تھا جیسے لحد میں پڑا مردہ اور حیرانی کی بات ہے کہ میں

اسی کی طرح اپنی تنہائی سے بے خبر تھا۔ وہ اپنے کفن میں مگن ہوتا ہے۔ میں اپنے اندھیرے میں مگن تھا۔ سانس قدرے درست ہوا تو پھر بازو پھیلا کر دیواروں کا سہارا لیتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کہاں گئی وہ منزل جہاں باقس رہتا تھا۔ روتی ہوئی وائلنوں اور آہیں بھرتی ہوئی گٹاروں کی آواز دور بہت دور اوپر کہیں سے آرہی تھی۔ یہ آوازیں سن کر مجھے ایک یقین تو ہو گیا کہ وہ کھلنڈرا ہمیں مدعو کر کے خود سورگ نہیں نکل گیا۔ اسے دعوت دینا یاد رہا ہے۔ اور وہ اسی بلڈنگ میں اپنے فلیٹ میں موجود ہمارا منتظر ہے۔ یہ اتنی بے ہنگم دھم دھم کی آواز کیا ہے؟ ڈرم ہو گا۔ نہیں اتنا بے تالا نہیں ہو سکتا کیا باقس سر شام اتنا مدہوش ہو گیا کہ ناچنے بھی لگا؟ کیا اس نے مہمانوں کا انتظار کئے بغیر پینا شروع کر دیا ہو گا؟ خیر! پیتا تو وہ ہر وقت رہتا ہی ہے۔ لیکن کیا وہ باقس جس کے ناچ کے اثر سے بے سُرے ساز خود بخود سُر میں ہو جاتے ہیں ناچ کے نام پر بے ہنگم طور پر کود رہا ہو گا؟ ہرگز نہیں، یہ کوئی اور ہی آواز ہے، جو یقیناً کسی اور جگہ سے آرہی ہے۔ اس کا فلیٹ قطعاً ایسی غلیظ، ننگی اور فحش آواز کا منبع نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے میرے سوا باقی سب جمع ہوں اور انہوں نے سوچا ہو کہ کیا پتہ وہ پہنچ بھی پاتا ہے یا نہیں اور زندگی نے اصرار کیا ہو کہ دیر مناسب نہیں رسومات شروع کر دو اور انہوں نے شروع کر دی ہوں۔ زندگی تو اپنی بے وفائی میں ویسے بھی ضرب المثل ہے۔

دونوں طرف دیواریں میرے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں اور درمیان میں پڑی پیچ در پیچ سیڑھیاں اوپر چلی جا رہی تھیں۔ کہیں کسی رخ ان سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا تو چل ہی رہی تھی۔ مگر دفعتاً ایک تیز جھکڑ اندھیری سیڑھیوں میں شاں شاں کا شور کرتا یوں گزرنے لگا کہ میرے قدم اکھڑ سے گئے اور بڑے کوٹ کے دونوں پٹ کسی اڑتے ہوئے بڑے پرندے کے پروں کی طرح ہوا میں تن گئے۔ ان سیڑھیوں میں کوئی اڑ تھوڑا ہی سکتا ہے یہ جعلی طور پر تنتے ہیں اس لئے میں نے انہیں زور سے کھینچ کر اپنے کپکپاتے بدن کے اردگرد لپیٹتے ہوئے جلدی

سے بٹن بند کر لئے۔ سردی جو پچھلے کئی مہینوں سے بڑھتی جا رہی تھی۔ اب بہت بڑھ گئی تھی۔ مگر اس جھکڑ نے چل کر تو گویا زمہریر وہ اب بھی اتنا تنگ اور سرد تھا کہ میرے سر اور ماتھے کی کھال کے اندر گھسا جا رہا تھا دھاتیں سردی سے سکڑ جاتی ہیں۔ اسی لئے شاید اور تنگ ہو گیا تھا۔ اس شہر میں جب سے یہ ان دیکھی اور ان جانی سردی پڑنی شروع ہوئی تھی۔ ہر زن و مرد کے سر کے اردگرد خدا معلوم کیوں اور کیسے لوہے کے کڑے خود بخود کسے گئے جو روز بروز تنگ سے تنگ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کے سروں پر تو لوہے کے پورے خود کس گئے ہیں اور نومولود تو خیر اب پیدا ہی خودوں سمیت ہوتے ہیں اگرچہ ابھی تک ان کڑوں کے سبب کوئی انسانی موت واقع نہیں ہوئی تاہم اطلاعات ملی ہیں کہ کئی لوگوں کے کڑے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ انہیں ہسپتالوں میں داخل کرانا پڑا ہے اور ان میں سے چند ایک کے کڑے تنگ ہوتے ہوتے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ اندیشہ ہے کہ کسی لمحے ان کی کھوپڑیاں تڑخ جائیں اور بھیجے باہر ابل پڑیں۔ کوئی ڈاکٹر یا سائنس دان اس آفت کے اسباب و علاج ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر رہا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جو لوگ کڑوں کے تنگ سے تنگ ہونے کی شکایت کرتے ہیں دراصل ان کی کھوپڑیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور وہ ایک لاعلاج مرض ہے البتہ اس کے سدباب کے طور پر فطرت نے خود راہ تلاش کر لی ہے اور بچوں کے سروں پر مکمل خود چڑھ گئے ہیں۔ آئندہ پندرہ بیس سال بعد انشاء اللہ کسی کو لوہے کے کڑوں کی تنگی کی شکایت نہ رہے گی۔ کیونکہ اس وقت تک ہر شکایت کرنے والے کا بھیجا تڑخی ہوئی کھوپڑی میں سے ابل کر خارج ہو چکا ہوگا۔ یہ تو حکماء کی رائے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مخلوق خدا اذیت میں مبتلا ہے۔

میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے جب دوبارہ بے حال ہو گیا تو یہ جاننے کے لئے کہ میں ابھی فلیٹ سے کتنی دور ہوں، میں نے پوری توجہ سے کان لگا کر وائلنوں اور گٹاروں کی آواز سننے کی کوشش کی۔ آوازیں اتنی ہی مدہم تھیں جتنی پہلے، مگر اب خلاف

توقع نیچے سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور وہ دھم دھم کی بے ہنگم بے ہودہ آواز بھی ابھی تک آرہی تھی۔ اور وہ بھی نیچے سے ہی آتی محسوس ہو رہی تھی تو میں بہت اوپر نکل آیا، سیڑھیاں اترنے سے پہلے دم لینے کے لیے وہیں بیٹھ گیا۔ میں ان سیلی اندھی سیڑھیوں میں بہت دیر تک بیٹھا کپکپاتا سانس درست کرتا رہا۔ مجھے رنج آرہا تھا کہ ابن بلڈنگ میں اتنے بہت سے فلیٹ ہیں اور ان میں اتنی بڑی تعداد لوگوں کی رہتی ہے اگر یہ لوگ سیڑھیوں میں تھوڑی سی روشنی کا انتظام کرلیں تو کیا ہرج کی بات ہے مگر وہاں تو کسی کھڑکی، روشن دان، دروازے کی دراڑ میں سے بھی روشنی نہیں آرہی تھی۔

''تمہیں پتہ نہیں جب سے کڑے کسے گئے ہیں۔ روشنیاں بند کر دی گئی ہیں۔ تم نے کسی سڑک، گلی، کوچے میں روشنی دیکھی ہے؟ کسی مکان، دکان میں روشنی دیکھی ہے؟''

غیر متوقع طور پر اپنے قریب یہ آواز سن کے میں گھبرا کے بولا ''تم کون ہو؟''

''میرا نام مسعود تھا۔ اب میرا نام نامسعود ہے۔''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''جو تم کر رہے ہو''

''میں تو پچھلے کئی گھنٹوں سے باقس کے فلیٹ کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔ اس نے آج شام کے لئے مجھے بلایا تھا۔''

''میں بھی اسی کے فلیٹ کی تلاش میں ہوں، مجھے بھی اس نے بلایا تھا۔ شاید جسے ہم سیڑھیاں چڑھنا سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں سیڑھیاں اترنا تھا۔ ہم نیچے کہیں تحت الثریٰ کے نزدیک ہیں۔۔۔ غور سے سنو! سازوں کی آہ و بکا کی آواز جو صرف باقس کے فلیٹ سے ہی آسکتی ہے۔ کتنی بلندی سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ساتھ ہی ایک گندی دھمک کی آواز بھی چلی آرہی ہے۔''

''روشنی۔'' یہ کہتے ہوئے نامسعود ہنسا پھر کہا ''ہم نے باہر سے بہت سا کالا پینٹ

منگوایا ہے۔ اتنا بہت سا کہ اس کے اوپر پھیلے ہوئے پورے آسمان پر ہم اس کو تھوپ دیں گے پھر نہ دن کو سورج نکلا کرے گا۔ نہ تو راتوں میں چاند چمکے گا۔ نہ ستارے دمکیں گے۔ دن رات یہ شہر سیڑھیوں کی طرح اندھیرے میں ڈوبا رہے گا۔

''نامسعود جو وقت ابھی نہیں آیا تو اس خیال سے مجھے کیوں ہراساں کرتا ہے۔''

''وقت ابھی نہیں آیا؟ کیا بکتا ہے۔ پینٹ پہنچ چکا ہے ٹھیکہ دے دیا گیا ہے کام شروع ہو۔۔۔۔''

''اچھا یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر لمحے کی بھی تو کوئی قیمت ہوتی ہے۔ اس کو سمجھو اب جب کہ وہ آخری رہ گیا ہے تو اور بھی زندہ ہے اور اس کا فلیٹ ڈھے نہیں گیا تو ہم آج اس کو تلاش کر کے رہیں گے۔''

اس کے بعد پتہ نہیں کتنی مرتبہ ہم دونوں ان سیڑھیوں کی لامتناہی لمبائیوں میں اترتے چڑھتے رہے اس کا فلیٹ تو کیا ملنا تھا سیڑھیوں کا زمین پر پہنچنے والا سرا بھی غائب تھا، ہم نے پوری طاقت سے دیواروں کو دھکے دیئے اور وہ اتنی ہی طاقت سے ہمیں پیچھے اچھال دیتیں ہم نے لوہے کے کڑوں میں کسے اپنے سروں کو ان پر پٹخا۔ نہ تو کوئی دیوار پھٹی اور نہ ہی سیڑھیوں نے ہمیں کوئی راہ دیا ہمیں یقین سا ہو گیا کہ ہم دو چوہوں کی طرح دیواروں کے پنجرے میں دوڑتے دوڑتے تھک کے سیڑھیوں پر گر جائیں گے۔ اور مر جائیں گے۔ مگر بدستور بھاگم بھاگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، اتر رہے تھے اور ہمارے دم سینوں میں سما نہیں رہے تھے۔ میں نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے نامسعود کا بازو پکڑ کر کہا ''ذرا رکو، آؤ ایک آخری کوشش کے طور پر دونوں مل کر پورے زور سے باقس کو پکارتے ہیں اگر اس نے ہماری آواز سن لی تو وہ آ کر راہ سجھاتے ہوئے ہمیں اپنے فلیٹ میں لے جائے گا۔''

میں نے ایک دو تین کہا اور تین پر ہم دونوں نے اپنی پوری جانیں مجتمع کر کے آواز لگائی۔

''باقس س س'' تیز ہوا کی شاں شاں میں ہماری آواز فتر بود ہوگئی۔ وقفے وقفے سے ہم نے دو تین بار اور پکارا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہم پر مایوسی چھا گئی۔ اتنے میں چپ راست کی پر ہیبت تحکمانہ آواز پر بہت بھاری بھر کم بوٹوں کی ایک تال میں دھمک سے سیڑھیاں لرزنے لگیں۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ ہم خوف سے دبک کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ جب وہ مارچ کرتے ہوئے ایک ایک کر کے ہمارے پاس گزر کر آگے بڑھ گئے تو ہم دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ایک جگہ جا کر ''ہالٹ'' کی آواز پے وہ سب رک گئے۔ حکم دینے والے شخص نے آگے بڑھ کر دروازہ یوں پیٹا کہ ہم سمجھے کہ دروازہ تیلی تیلی ہو کر بکھر جائے گا۔ وہ چنگھاڑا۔

''باقس دروازہ کھولو۔''

اندر سے باقس کی آواز آئی ''تم کون ہو؟''

''ہم کوئی بھی ہوں۔ تم دروازہ کھولو۔ تم نے اندر سے روشنی کی ہوئی ہے۔''

''اندر کوئی روشنی نہیں۔ تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔''

''تم نے اندر زندگی چھپائی ہوئی ہے۔''

''یہاں کوئی زندگی نہیں۔''

''تمہارے کمرے سے سازوں کی سسکیاں سنی گئی ہیں۔''

''تمہیں بخوبی علم ہے کہ موسیقی کبھی کی مر چکی۔''

''تم دروازہ کھولو ہم تمہارے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔''

''تمہیں میرے گھر کی تلاشی لینے کا کوئی حق نہیں، یہ میری چار دیواری ہے اور اس میں کسی اجنبی کو داخل ہونے کا اختیار نہیں۔''

''اگر تم دروازہ توڑو گے تو میں بندوق سے اس کی حفاظت کروں گا'' پھر انہیں سناتے ہوئے بلند آواز سے اپنے ملازم کو آواز دی ''مشرقی! اپنی بندوق لانا جو تو شرق میں چلایا کرتا تھا، اس کے بغیر یہ باز نہیں آئیں گے۔''

مشرقی نے اسی طرح بلند آواز میں جواب دیا ''یہ لیجئے بندوق۔''

اس پر میں نے اور نامسعود نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ ہمیں پتہ تھا کہ مشرقی اور باقس، دونوں کے پاس کوئی بندوق نہیں اگر انہوں نے دم نہ دکھایا تو باقس مارا گیا۔

حکم دینے والے شخص نے کہا ''باقس تو اچھا نہیں کر رہا تجھے پچھتانا پڑے گا کل ہم ڈائنامیٹ لے کر آئیں گے اور تیرے فلیٹ کو اڑا دیں گے پھر تجھے پتہ چلے گا۔''

''ٹھیک ہے لے آنا، تب بات کریں گے۔''

وہ شخص اپنے دستے کو اسی طرح پریڈ کراتا ہوا واپس لے گیا۔

میں نے پوچھا ''نامسعود کیا باقس کی اس جرات پر تیرا اکڑا ابھی ڈھیلا پڑا'' کہنے لگا ''ہاں کوئی ہوا بھر فراخی محسوس تو ہوئی ہے۔''

ہم نے جا کر آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا، باقس نے پردہ ہٹا کر ہمارے چہرے دیکھے اور دروازہ کھول دیا۔ اندر واقعی روشنی تھی جو زندگی کی روتی آنکھوں سے نکل کر کمرے میں اجالا کر رہی تھی اور کمرے کے وسط میں گھٹنوں تک کٹی اگلی ٹانگوں والی بھینس نے ناچ کے نام پر کود کود کر ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ اچھا تو وہ غلیظ اور مکروہ دھمک کی آواز اس کے ناچنے کی تھی، اس کی اگلی ٹانگیں کہاں گئیں؟ اوہ یاد آیا نیچے جہاں سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں وہاں قصاب کی دکان کی دیوار کی اوٹ میں ابلتے پانی کے کنستر میں جو بھینس کی دو گھٹنوں تک کٹی ٹانگیں پڑی تھیں وہ اس کی تھیں اور انہیں وہاں اس لئے چھوڑ آئی تا کہ اس سردی میں ناچتے ناچتے کہیں شل نہ ہو جائیں۔ اب یہاں سے فارغ ہو کر جب جائے گی تو نیچے پہنچ کر اپنی گرم گرم ٹانگیں اور پاؤں پہنے گی اور چل دے گی۔ مے سے بھرا خم کونے میں پڑا تھا۔ فقیر صحرا، صوفی سیاہ پوش، ستارہ گل، مستانہ زہرا اور حتی کہ باقس بھی ہاتھوں میں خالی جام پکڑے دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے کٹی ٹانگوں والی۔۔ بے تحاشا کودتی بھینس کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اسے روکنے

سے قطعی قاصر تھے۔ ہم بھی خالی جام ہاتھوں میں پکڑ کرانہی کی طرح دیوار کے ساتھ لگ کراسے دیکھنے لگے۔ زندگی ایک کونے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی اپنی آنسو بہاتی آنکھوں سے صرف چھت کو تکے جا رہی تھی۔ زندگی کو یوں زاروقطار روتے دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا ”زندگی میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔ میرے بلانے پہ تو آج شام یہاں آئی اور تیری تذلیل ہوئی“ اس نے کوئی جواب نہ دیا اسی طرح آنسو بہاتی رہی اور بھینس اسی طرح اودھم مچاتی رہی۔

نامسعود کہنے لگا، ”دوستو! اس بھینس کو تو کمرے سے نکالنے کی کوئی تدبیر کی ہوتی۔“

باقس نے جواب دیا ”ہم سب تو اپنی سی کر چکے مگر یہ نہیں نکلتی، پہلے ڈنڈے مارے پھر آہیں بھرتی ہوئی موسیقی کو بند کیا اس کے بعد دروازے میں کھڑے ہو کر چارہ دکھایا لیکن یہ کسی طور پر مانتی ہی نہیں، بس اسی طرح کودے جاتی ہے اب تم آئے ہو کوئی چارہ کر کے دیکھو۔“

”باقس! تمہاری دیوتائی شکتی بھلا کس کام کی جو ایک اپاہج بھینس کو باہر نہیں نکال سکتی۔“

اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اقرار کیا ”ہاں! میں تو صرف مے اور رقص کا دیوتا ہوں بھینس میرے بس میں نہیں۔“

”مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے اسے کتاب دکھا کر دیکھتے ہیں“ یہ کہتے ہوئے نامسعود دوسرے کمرے میں دوڑتا ہوا گیا اور بہت سی کتابیں بازوؤں میں بھر کے لے آیا۔ اس نے کچھ ورق پھاڑ کر اس کے سامنے کئے تو وہ کودنا بھول کر نہایت رغبت سے انہیں کھانے لگی۔ وہ اسی طرح ورق پھاڑ پھاڑ کے کھلاتا ہوا اسے کمرے سے باہر لے گیا پھر گھر کی ایک ایک کتاب لے جا کر ورق ورق کر کے سیڑھیوں میں نیچے پھیلا دی۔ وہ تیزی سے ادھر اُدھر منہ مارتی ورق ورق چرتی نیچے اتر گئی۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را

قصاب بر د حالانکہ اس قصے گاؤ سے پہلے نپٹ چکا تھا ہم نامسعود کے بہت ممنون و مشکور تھے اس پہ واہ واہ کے ڈونگرے برسائے گئے کہ آخر اس کی تدبیر کی بدولت سب کی اس بے ہودہ بھینس سے گلو خاصی ہوئی۔

باقس نے خم کی طرف نظر بھر کے دیکھا اور آن واحد میں تمام خالی جام مے سے چھلک اٹھے۔ افسردہ اور مایوس چہروں پہ مسکراہٹ کھل اٹھی۔ اس نے جام بلند کرتے ہوئے زندگی کی طرف دیکھ کر جوش سے کہا ''بنام زندگی''۔ وہ کونہ جہاں بھرپور جوان زندگی چھت کو تکتی ہوئی آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی اب بھائیں بھائیں کرتا خالی پڑا تھا۔ ہم سب نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر زندگی کا کہیں کوئی سراغ نہ تھا۔ اگر نور جاموں سے منعکس نہ ہو رہا ہوتا تو پورا کمرہ تاریکی میں ڈوب چکا ہوتا۔ باقس کا اٹھا ہاتھ نیچا ہو گیا اور وہ شدید صدمے سے سنبھلنے کے لئے دیوار سے کمر لگا کر، خاموش گردن نیچی کئے کھڑا اپنے غم میں ڈوب گیا۔ سب پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔

''تدبیر کند بندہ تقدیر کند خند'' کچھ دیر کے بعد باقس سنبھلا اور کہا ''جس کی خاطر یہ سب کیا دھرا تھا وہ تو چلی گئی۔ اب بولو دوستو۔''

فقیر صحرا نے کہا ''باقس یوں لگتا ہے جیسے میری آتما کا انت مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پہ جا کر برف کا تودہ بن گیا ہو۔ وہاں سے نہ کبھی برف پگھل سکتی ہے اور نہ کبھی میری آتما کا انت واپس لوٹ سکتا ہے۔ تم جانتے ہو میں تو فانی ہوں۔ سورج کے سوا نیزے پہ آنے کا کہاں تک انتظار کر سکتا ہوں۔''

صوفی سیاہ پوش نے کہا ''ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ ہوتا ہے جو اس کے اندر مرتے دم تک زندہ رہتا ہے اور یوں اس کے ضمیر میں معصومیت اور حیرت کے عنصر کو قائم رکھتا ہے۔ میرے اندر وہ ننھا بچہ اب مر گیا ہے اور اس کا زہر اتنا پھیل چکا ہے کہ آہستہ آہستہ میری روح کے اندر سرایت کرتا محسوس ہو رہا ہے۔''

مستانہ زہرہ بولنے لگا تو اس کی آواز اس انداز میں نکل رہی تھی جیسے کوئی عالم نزع

میں بولنے کی کوشش کر رہا ہو'' میں تو سانس بھی کانوں کے راستے لیتا تھا۔ اب ان میں سیسہ بھر دیا گیا۔'' ستارہ گل نے کہا'' سینکڑوں صدیوں کے صرف سے میں نے جو مسکرانے کا فن سیکھا تھا وہ میرے ذہن سے اب قطعی ماؤف ہو گیا ہے۔ میں محض پتھر کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہوں جو نہ ہنستا ہے۔ گلنار علم میرے ہاتھ سے گر کر کہیں صحراؤں کی ریت تلے دب گیا ہے مگر زندگی میں ہمیں واپس آنے میں چند صدیاں تو ضرور لگیں گی۔ اگر میں نہیں گلنار علم نکال کر پھر کندھے پر رکھ کر آگے بڑھے گا۔''

باقس نے کہا'' دوستو! اپنے اپنے جام بنام زندگی خالی کرو اور پھر بھر و اور لنڈھاتے چلو۔ میں زندگی کو پہلے بھی کئی بار اپنے پرستاروں سے مایوس ہو کر روٹھ کر جاتے دیکھ چکا ہوں۔ ثابت قدم رہو، وہ واپس آئے گی اور ہم اس کی شان میں بہت بڑا جشن کریں گے۔ مجھے پتہ ہے آسمان پہ تھوپے جانے والا سیاہ پینٹ آخر پگھل کر گر جائے گا۔ روشنی کے آگے بند باندھنے کی یہ اولین کوشش تو نہیں پہلے بھی بہت لوگ کر چکے ہیں۔ نور کے سیلاب کے آگے ہر رکاوٹ پر کاہ کی مثل بہہ جاتی ہے۔ تمہارے سروں کے گرد کسے ہوئے آہنی کڑے کوئی ہمیشہ قائم تو نہیں رکھ سکتا؟''

ہم سب یک زبان ہو کر پکارے''تب تک کیا کریں۔''

''بتایا جو ہے۔ جام روشن رکھو'' اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ پتہ نہیں وہ باقس تھا کہ میوز تھی کہ دونوں تھے۔

اس افسانہ میں سیڑھیاں انسان کے لگاتار سفر کی علامت ہیں۔ باقس خوشی اور سرمستی کا دیوتا ہے۔ اگلی دونوں ٹانگیں کٹی بھینس جو ادھم مچانے سے رک نہیں رہی، جس کو نا مسعود کتابوں سے کاغذ پھاڑ پھاڑ کر کھلاتا جاتا ہے اور پھر کمرے سے باہر نکال دیتا ہے۔ یہ شاید ایسے زود نویس prolific writers کے بارے میں ہے جو دوسروں کے خیالات چرا چرا کر ادبی دنیا میں ادھم مچائے رکھتے ہیں۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ یہ مارشلائی حکومت بھی ہو سکتی ہے جو کتابیں یعنی علم و خرد کی دشمن ہوتی ہے۔ آپ اکرام اللہ کا اشارہ

سمجھ سکتے ہیں۔ سروں پر جبراً چڑھائے گئے کڑے کا مطلب بھی سمجھ سکتے ہیں۔ میں یہ سمجھا ہوں کہ ہر قسم کی سنسر شپ وہ ہتھیار ہوتا ہے جس کے تحت ایک ڈکٹیٹر اپنی مرضی اور من مانی سے حکومت کر سکتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مصنف اور نامسعود مل کر زور سے چلاتے ہیں اور بعدازاں فوجیوں کے واپس مڑ جانے پر محسوس کرتے ہیں کہ سروں کے گرد لپٹے کڑے کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اکرام اللہ اس علامت کے ذریعے ہر باشعور انسان کو مزاحمت کا درس دے رہے ہیں۔ پھر کہا گیا ہے کہ بچے تو پیدا ہی سروں پر لوہے کے خود پہن کر ہوں گے۔ یہ علامت واضح کرتی ہے کہ جب ناقص تعلیم، فنونِ لطیفہ پر پابندی، اظہارِ رائے کا گلا گھونٹ دیا جانا اور ذرائع ابلاغ پر سخت حکومتی کنٹرول ہو گا تو ایسے سماجی سیاسی ماحول میں پروان چڑھنے والی نسلیں ذہنی پسماندگی کے ساتھ زندگی گزاریں گی۔ تب بھی اگر کوئی فرد سوچ کی پرواز بلند کرے گا تو درد کے مارے اس کا دماغ کڑے سے باہر پھول کر پھٹ جائے گا اور وہ نجات پا جائے گا۔ اب ہم بانو قدسیہ محترمہ سے سوال کر سکتے ہیں کہ جبر و استبداد، ناانصافی، سیاسی گھٹن، حقوق کا ساکت ہو جانا، فنونِ لطیفہ کا مرجھا جانا، تحریر و تقریر کا گلا دبا دیا جانا، رزقِ حلال کمانے والوں کو بھی طرح طرح سے ذہنی اذیتوں سے گزارنا (پریشر ککر)، کیا دیوانگی، خودکشی یا پھر اجتماعی بغاوت کا سبب نہیں بن سکتا؟ لیکن محترمہ کو 1947ء کے فسادات انقلابی روح نہ عطا کر سکے۔ ایوب خانی دور کی غیر آئینی حکومت کے تحت ہر طرح کی کرپشن آپ کی رگِ حمیت کو نہ پھڑکا سکی۔ بھٹو صاحب کا اپنے مخالفین اور محسنوں کو قتل کروانا آپ کی چشم نم نہ کر سکا۔ تو ہم کیا توقع رکھتے کہ آپ ضیاء کی غیر آئینی حکومت کے خلاف کچھ لکھتیں۔ آپ نے انہیں وہ مردِ مومن سمجھ لیا جس کا پرندوں کو صدیوں سے انتظار تھا۔ یہ آپ نے جان بوجھ کر کیا؟ آپ ہی وضاحت فرما سکتی ہیں۔ ندیم پراچہ کی حال ہی میں چھپی اعلیٰ معیار کی تحقیق End of Past پڑھ لیجئے اور توبہ کیجئے۔ اب بھی وقت ہے آپ نے ''راہ رواں'' میں مغرب کی ترقی کی جو وجوہات بیان کی ہیں ان خطوط پر

سوچتے ہوئے کوئی شاہکار ناول یا ناولٹ لکھ دیجئے جس سے عوام الناس جو آپ کی افیم کے نشہ میں سوئے پڑے ہیں اٹھ سکیں اور ایک صبح نو کے لیے جدوجہد کر سکیں۔ پاکستانی ادب میں نوجوانوں کی فکری تربیت کے لیے جناب محمود فریدی کا ناول ''سچے دوست کی تلاش'' ایک خاصے کی چیز ہو سکتا تھا لیکن اس کو کسی حکومتی ادارہ کی پشت پناہی حاصل نہ تھی۔

لاطینی امریکہ کے ممالک ارجنٹائن، بولیویا، برازیل، چلّی، پیراگوئے اور یوراگوئے میں C.I.A کی پشت پناہی میں چلنے والے آپریشن CONDOR میں انسانیت سوز مظالم کی داستانوں کو وہاں کے بہادر ادیبوں نے ناولوں اور افسانوں کی صورت میں بیان کیا۔ اس بناء پر آج ان تمام فوجی حکمرانوں کو ایک ایک کر کے قید میں ڈالا گیا اور مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔ کئی تو قید میں ہی مر گئے باقی بڑھاپے میں سزاؤں کے منتظر ہیں۔ کونسا خوف آپ کو ایسے عوام دشمنوں کے خلاف لکھنے سے روکتا رہا۔ پھر من گھڑت تھیوریوں پر مشتمل یہ راجہ گدھ ہی نہ لکھتیں تو بھی بات بن جاتی۔ کیونکہ دین اسلام میں ایمان کا کمزور ترین درجہ برائی کو دل میں برا جاننا ہے۔ لاطینی امریکی ادب سے دو ہی مثالوں پر اکتفا کروں گا:

One Hundred Years of Solitude by Gabriel Garcia Marquez یا پھر ہینریخ ابسن کے ڈرامہ "A Doll's House" کی طرز پر کوئی روایت شکن ڈرامہ ہی لکھ دیں۔ مگر کیسے؟ اس کے لیے ڈر، خوف، لالچ اور ذاتی اغراض سے پاک روح اور نظریہ حیات درکار ہوتا ہے۔ تب اشفاق احمد خان کی وطن سے محبت کا حق بھی ادا ہو جاتا۔ دنیا اور نوجوان نسلیں بڑوں کے صاف ستھرے اور بامقصد علم کے آگے سر جھکاتی ہیں نہ کہ خالی خولی تلقینوں یا نصیحتوں پر۔ یہاں میں روسی، فرنسیسی یا انگریزی لٹریچر کی طرف نہیں جاتا ورنہ بات طول کھینچ جائے گی۔

○

باب 4

غلط کردار نگاری و غلط منظر کشی

اس ناول کے تین بڑے کردار ہیں سیمی شاہ، آفتاب اور قیوم جبکہ تھوڑی دیر کے لیے پروفیسر تنویر کو بھی بڑا کردار ماننا ہوگا گو کہ ان کا کردار محض ایک خاص سیاسی نظریہ کی تنقیص کے لیے ہی گھڑا گیا ہے۔ باقی تمام کردار جیسے قیوم کا والد، چچا غلام رسول، عابدہ، امتل، روشن، بھائی مختار، بھابھی صولت اور دیگر لوگ ان بڑے کرداروں کی وضاحت کے لئے بنائے گئے۔ اس باب میں ہم بڑے اور دو ایک چھوٹے یعنی ضمنی کرداروں کو بہ تفصیل زیرِ بحث لائیں گے۔

سیمی شاہ:

ناول کے آغاز سے ہی علم ہو جاتا ہے کہ سیمی شاہ بچپن سے حساس و زود رنج لڑکی تھی۔ سہانے سپنوں کی بجائے زندگی کی تلخیوں کا ادراک اوائل عمری سے ہی حاصل کر چکی تھی۔ کوئی بھی حادثہ اس انسان کے لئے مانا جاتا ہے جو اس کے ساتھ پہلی بار ہو۔ اور جو انسان حادثوں کا کھلاڑی، من موجی پختہ کار ہو چکا ہو کسی نئے حادثے کو بھی گزرے ہوئے حادثات کا تسلسل سمجھتے ہوئے جھیل جائے گا اور دوبارہ اپنی ڈگر پر چل نکلے گا۔ سیمی شاہ اپنے والد سے برگشتہ تھی بلکہ شدید نفرت کرتی تھی۔ وہ اس کے نودولتیا سماجی حیثیت کی حقیقت سمجھ چکی تھی اور جانتی تھی کہ وہ بڑھاپے کے باوجود نوجوان لڑکیوں کا متلاشی رہتا تھا۔ لہٰذا ایسی ذہنیت والے انسان کے لیے نوجوان بیٹی کا وجود اپنے گھر میں

تب ہی برداشت ہوسکتا تھا اگر وہ اپنی نئی سے نئی سہیلیوں سے متعارف کرواتی رہتی۔ یہ بات سیمی شاہ جیسی حساس اور سمجھ دار لڑکی کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ سیمی شاہ نے بھی ناول میں اپنی تمام گفتگو کے درمیان ایک بار بھی اپنے والد کا نام نہیں لیا ایسے ہی جیسے بانو قدسیہ محترمہ نے اپنا تعارف ''مردِ ابریشم'' اور ''راہ رواں'' میں کروایا ہے اپنے والدِ گرامی کا نام گول کر گئی ہیں بلکہ وکی پیڈیا پر بھی والد کا نام نہیں ملتا۔ سیمی شاہ کا تلخیوں کے جام در جام لنڈھانے کے بعد صرف آفتاب سے ہی محبت کرنے پر ہی بضد رہنا عجیب لگتا ہے۔ بغور نفسیاتی تجزیہ یا تحلیل نفسی کے کلیہ پر اس کا بکھرنا آفتاب سے محبت کی ناکامی نہیں بلکہ خاندانی انس اور محبت کی کمی ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ ناول سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا والد اسے اس کے ماموں کے ہاتھ ہر ماہ معقول رقم بطور خرچہ بھیجتا رہتا تھا۔ بے حسی کی انتہائی صورتِ حال اور بالآخر خودکشی مصنفہ محترمہ کی ذاتی اختراع ہے۔ یا پھر بانو قدسیہ محترمہ کہانی کو آخری درجہ کا pasimism دینے کے لیے اولاً تو سیمی شاہ کا قیوم کے ہاتھوں خوب جسمانی استحصال کرواتی ہیں۔ دوسرا اسے خودکشی کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔ خودکشی تمام معاشروں کا مسئلہ ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ جب کمزور دل ودماغ کے انسان کسی اہم مسئلہ پر اپنے آپ کو چاروں شانے چت اور خلا میں معلق محسوس کرتے ہیں تو خودکشی آخری ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ اسی نفسیاتی اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم سیمی شاہ کا کیس بغور زیرِ مطالعہ لاتے ہیں تو ایک عجیب حقیقت سامنے آتی ہے۔ جو لڑکیاں اوئل عمری سے اپنے والد کی جنسی بے راہ روی سے compromise نہ کرسکیں تو ان کی abnormality تاعمر کے لیے مرد ذات سے نفرت کی صورت میں نکلتی ہے۔

ہم جنسوں میں مطمئن جبکہ جنسِ مخالف سے کلیتاً lethargic ہو جاتی ہیں۔ سیمی شاہ والد کی شخصیت کے اس پہلو سے اس حد تک برگشتہ و ناراض تھی کہ گھر ہی نہ رہتی تھی۔

ایسے نفسیاتی بگاڑ کی شکار لڑکیاں تمام مردوں کو ہی نشانہ نفرت بناتی ہیں۔ سیمی شاہ کو کسی طرح آفتاب میں نظر آ گیا کہ وہ اسے دائمی وفا دے سکتا ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کیوں کہ قانون کہتا ہے exception is always there۔ اب کہانی میں موڑ آتا ہے آفتاب مظبوط اعصاب اور عہد کو پورا کرنے والا مرد نہیں نکلتا وہ نہ صرف سیمی شاہ کو چھوڑ دیتا ہے بلکہ پڑھائی بھی اور اپنی کزن سے شادی کر لیتا ہے۔ اس اثناء میں سیمی شاہ ولایت کے درجے پر پہنچ چکی تھی۔ اسے بن دیکھے آفتاب کی منگیتر کی شکل کا پتہ لگ جاتا ہے۔ اسے بن دیکھے آفتاب کے شادی کے لباس اور دیگر باتوں کا اپنے گیان اور دھیان سے پتہ چلتا رہتا ہے اور قیوم حیران ہوتا رہتا ہے۔ یہ کہانی ایک ناولٹ کی شکل میں ختم ہو سکتی تھی۔ سیمی شاہ کا خلا میں گھورنا اور چاروں طرف سے راہیں مسدود نظر آنا وہی موقع ہے جس دن آفتاب کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس موڑ پر سیمی کا یا تو مردوں سے تاعمر کے لیے کوئی سخت اظہارِ نفرت بنتا ہے یا پھر فوری خودکشی۔ لیکن اس نقطہ پر بانو قدسیہ محترمہ کا اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو وہ مردم بیزار کی بجائے عورت بیزاری کی طرف جاتی ہیں۔ وہ اس کے بعد بھی سیمی شاہ کو زندہ رکھتی ہیں اور اس کو قیوم جیسے سمجھدار عاشق کے ہاتھوں جنسی تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہاں بانو قدسیہ محترمہ سیمی شاہ کے روپ میں انسانی تاریخ میں گزر چکی ان تمام لڑکیوں کے لئے جو عشق یا محبت کے عمل سے گزریں بلکہ آنے والی نسلوں میں بھی لڑکیوں کے لئے ایک ہی سزا تجویز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ سیمی شاہ کی گپت طاقتوں کو بڑھتے ہوئے بھی دکھاتی چلی جاتی ہیں۔ اب توجہ فرمایئے سیمی شاہ جیسی لڑکی جو وجدان و نروان کے اتنے بلند درجہ تک پہنچ چکی ہو کہ اسے آنکھیں بند کر کے ہی محبوب کی ہر نقل و حرکت سامنے فلم کی طرح چلتی نظر آ رہی ہو وہ خودکشی کیوں کرے گی؟ لیکن ان تمام اصولوں کے برخلاف بانو قدسیہ محترمہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ سیمی شاہ کا والد رشوت خور تھا لہٰذا سیمی شاہ genetically mutate پیدا ہوئی

اور اس کا انجام بھیانک ذہنی استحصال، بعدازاں بھیانک جسمانی استحصال اور پھر خودکشی ہی بنتا تھا۔ دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ سیمی شاہ آفتاب کی محبت میں اس قدر ڈوب چکی ہوتی ہے کہ وہ قیوم سے جنسی تعلق اس لیے قائم کرتی ہے کہ قیوم آفتاب کا روم میٹ رہ چکا ہوتا ہے اور تصور کرتی ہے کہ آفتاب نے کبھی نہ کبھی قیوم کو چھوا ہوگا یا گلے ملا ہوگا لہٰذا اس نقطہ پر میاں مجنوں کے برابر پہنچ چکی تھی جو سگِ لیلیٰ سے پیار اس سگ کی لیلیٰ سے نسبت کی وجہ سے کرتا ہے شکر ہے میاں مجنوں کو کہیں لیلیٰ کی کوئی سہیلی ہاتھ نہ لگ گئی پھر سیمی شاہ کی کہانی سو فیصد justified ہو جاتی تھی۔

کہانی تو قیوم، سیمی شاہ اور آفتاب کے ٹرائی اینگل کی صورت میں رزقِ حرام تھیوری سمیت آفتاب کی شادی پر انجام پذیر ہو سکتی تھی۔ مگر پرندوں کی زبانی ایک نوزائیدہ فوجی حکمران کو امیرالمومنین کی آس دلانے اور پھر پروفیسر سہیل کے آدرشوں کے ذریعے عوام کو افیم کی گولیاں دینے، پھر مختلف thesis قائم کر کے ان کے anti thesis دینے پھر بیچ بیچ میں اپنی داستان گوئی کے جواہر دکھانے اور پھر انسانوں میں رزقِ حرام کی من گھڑت تھیوری دینے، بیچ میں بابوں کی افادیت و پراسراریت دکھانے یا پھر اپنی کتابوں کو طوالت دینے کے لیے ناول کو 500 سے اوپر صفحات پر پھیلا دیا۔ سیمی شاہ کے کردار کو بے جا طوالت بخش کر نوجوان ذہنوں کو پراگندہ کرنے کے سوا اس کا کوئی مطلب نظر نہیں آتا۔ ایسا تعزیراتی لٹریچر افراد ملت کی اصلاح کی بجائے انہیں شرمندگی، زودرنجی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں دیتا بلکہ بے علمی کی طرف لے جاتا ہے اور جوانوں کا جوہرِ حُریت خشک کر دیتا ہے۔

پروفیسر تنویر:

اس کردار کو محض کمیونزم کی توہین کرنے کے لئے گھڑا گیا حالانکہ پورے ناول کے

پلاٹ میں اس کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ روس افغانستان میں آچکا تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ کا نعرہ گھر گھر گونج رہا تھا لہذا بانو قدسیہ محترمہ کو مناسب معلوم ہوا ہو گا کہ لگے ہاتھوں کمیونزم کا thesis قائم کرتی ہیں۔ قیوم کی زبانی سنیئے:

''وہ پکے سوشلسٹ تھے۔۔۔۔۔ تھیوری کی حد تک وہ معاشرے کی ہر مصیبت کو دولت کی غلط بانٹ سے منسوب کرتے۔۔۔۔۔ بی۔اے کے پہلے سال میں انہوں نے مجھے منہ کے بل گرا لیا۔ لیکن ایک سال ان کا سایہ بنے رہنے کے بعد مجھے پتہ چلا، کہ وہ ایک اور قسم کے ماسٹر غلام رسول ہیں۔ وہ دل سے سوشلسٹ تھے لیکن صرف کتابی طور پر ان کا رہنا سہنا، ملنا جلنا، زندگی بسر کرنے کی چھوٹی چھوٹی جزیات کسی فیوڈل لارڈ کی سی تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے سوشلسٹ نظریے پر تنقید برداشت کرتے تھے، نہ اپنی طرزِ زندگی پر۔''

صفحہ 18 پر anti thesis کے طور پر بانو قدسیہ محترمہ استاد شاگرد کے درمیان مکالمہ کرواتی ہیں اور اس پر فیسر تنویر کو short tempered اور ایسے جملے ان کے منہ سے نکلواتی ہیں جو نہ تو کسی سوشلسٹ کے منہ سے ادا ہوتے ہیں۔ انہیں بھی اعلیٰ ماحول میں زندگی گزارنے کا حق ہوتا ہے مگر پروفیسر تنویر کو ایک شاگرد کے ہاتھوں جس طرح لاجواب ہوتے دکھایا گیا ہے خالصتاً بانو قدسیہ محترمہ کا خود ساختہ ہے۔ اب اپنے آخری ناول ''حاصل گھاٹ'' میں روس میں کمیونزم کے خاتمے پر دنیا میں امریکہ کے اکیلی طاقت بن کر دہشت پھیلانے کی وجہ سے انسانیت جس دکھ اور تکلیف میں مبتلا ہے اس کا رونا روتی ہیں تو ان کا پروفیسر تنویر کی توہین اور افسانہ ''روس سے معذرت کے ساتھ'' خود بخود اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ محترمہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد خان نظریاتی طور پر لگاتار گومگو ذہنی کیفیت کا شکار رہے۔

پروفیسر سہیل:

By God یہ کردار تو ہو بہو اشفاق احمد خان مرحوم کی کاپی لگتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے جو کچھ بھی پروفیسر سہیل نے بولا وہ لکھا ہی اشفاق احمد مرحوم نے ہوگا۔ آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجیے اور پھر اشفاق مرحوم کی تحریریں یا بڑھاپے میں ریکارڈ کرایا گیا ٹی وی پروگرام ''زاویہ'' دیکھ لیجئے لگے گا وہی بات کر رہے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ اشفاق احمد مرحوم خود بھی دیال سنگھ کالج میں لیکچرار بھرتی ہوئے تھے اور ممکن ہے جس طرح پروفیسر سہیل اپنے طلبہ و طالبات کو ایک topic دے کر اس پر ان سے سخت مشقت کرواتا ہے اور بعدازاں اپنی تھیوری ایجاد کر لیتا ہے۔ اسی طرح لیکچرار اشفاق مرحوم بھی اپنے گھر کے لئے اپنے نئے نویلے آئیڈیاز برائے زودنویسی لے جاتے ہوں۔ خیر یہ سب میں نے جملہ ہائے معترضہ کے طور پر لکھ دیا۔ اب ہم سنجیدگی سے ان کے کردار اور آدرشوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اپنے پہلے لیکچر میں ہی ناول کے theme پر سے پردہ اٹھاتے ہیں:

> ''یعنی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاگل پن دو قسم کا ہوتا ہے۔۔۔ ایک مثبت ایک منفی۔۔۔۔۔۔ ویری گڈ۔''

اب توجہ فرمائیے پاگل پن محض ایک ہی قسم کا ہوتا ہے جو لازماً منفی اثرات لیے ہوئے ہوتا ہے۔ جسے یہ مثبت پاگل پن کہتے ہیں وہ انسانی تخیّل و وجدان کی وہ کیفیت ہے جو کسی سائنسدان، کسی صوفی، کسی آرٹسٹ یا کسی فنون لطیفہ کے ماہر پر وارد ہوتی ہے تو معاشرت، سائنس، مذہب، شاعری، فلم یا آرکیٹکچر کے شاہکار و ایجادات سامنے آتے ہیں۔ لیکن مثبت پاگل پن کی بنیاد اگر یہ شروع میں نہ رکھتے تو ناول کا آخری جملہ وجود میں لانا مشکل ہو جاتا۔۔۔ آپ یہاں پر دیوانگی، پاگل پن اور جنون میں فرق سمجھ کر

آگے چلیے گا تا کہ بعدازاں ان کی غلط تھیوریوں کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ عام قاری کے لیے یہ ہی پر تحیر ہے کہ بانو قدسیہ محترمہ نے پاگل پن کی مثبت قسم متعارف کروا ڈالی ہے۔ واہ بھئی واہ!۔

پھر اس ناول میں پروفیسر سہیل کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں جو اپنے اپنے ابواب میں زیرِ بحث آئیں گے مگر یہاں میں ان کی شخصیت پر بحث کروں بطور گُرگ کہن یا بطور گرگا ناول میں سے دو حوالہ جات پیش کر کے۔

قارئین! یاد رہے یہ ناول اس دورِ حکومت میں لکھا گیا جب معاشرے کو تہہ و بالا کر دیا گیا۔ جب جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ ہم پاکستان کو اسلام کی لیبارٹری بنانا چاہتے ہیں۔ آئین کو بالائے طاق رکھ کر انفرادی خیالات پر ریاستی اداروں کو چلانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اولاً تو ادب کی ضرورت ہی نہ تھی مگر طوعاً و کرہاً وہ حکومت ادب کو قبول کر سکتی تھی تو راجہ گدھ جیسا ادب درکار تھا نہ کہ اکرام اللہ کے گرگ شب جیسا۔ ایک طرف تو قیوم جیسا متنوع کردار، سیمی شاہ جیسی لڑکی کا من گھڑت کردار جو کہ جوان بچیوں کو ڈرانے والا تھا تو دوسری طرف ایک تلقین شاہ ٹائپ کردار کی اشد ضرورت تھی جو پورا حکومتی ایجنڈا پیش کر رہا ہو۔ نوجوان وکلاء، اساتذہ، یونیورسٹی پروفیسروں اور پھر آنے والے نوجوان طلبہ و طالبات کو خود غرضی، حرص اور لالچ کی راہ دکھاتا نہ کہ بغاوت، آزادی اور حریت کے لیے روح کو گرمانے والا کردار۔

ذرا ملاحظہ فرمایئے پرفیسر سہیل کے کردار سے بانو قدسیہ محترمہ پوری قوم کے جوہر محرکہ کو کونسی غلط سمت میں رہنمائی فرما رہی ہیں:

"سر آپ کا کوئی مشن ہے۔۔۔۔؟

ہاں ہے۔

کیا۔۔۔ ہے سر؟

میں اب انیسویں گریڈ کے لیے کوشش کر رہا ہوں ۔۔۔ پھر میں پروفیسر ہونے کی کوشش کروں گا ۔۔۔۔۔۔ میں پاکستانی طلبہ کو تعلیم دینے کا مشن لے کر تمہارے کالج میں آیا تھا۔۔۔۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ وہ مشن میرے بس کا نہیں ۔ اسی لئے میں نے اپنی تبدیلی نیو کیمپس میں کروالی ۔ تعلیم جب سے عام ہوئی ہے لوگ تعلیم کی تلاش میں نہیں رہے اس لئے میں نے اپنا مشن بدل لیا ہے۔۔۔ میں اب فقط اپنی زندگی بنانا چاہتا ہوں۔"

اب مندرجہ بالا پیرا گراف میں ایک ڈکٹیٹر کی مکمل حمایت کے لیے زبردست آدرش موجود ہے۔ سوسائٹی کے تمام ورکنگ طبقات کیلئے ایک ہی درس ہے۔ کمینگی کی حد تک خودغرضی کا درس ۔ ناول کے ایک معتبر کردار کی زبان سے ایسے کلمات ادا کروانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اجتماعی مثبت شعورِ تعلیم کی افادیت، جفاکشی سے قومی خدمت، حکومت وقت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا کوئی جذبہ اس ناول میں موجود نہیں ۔ یہ اکرام اللہ کے "سیاہ آسمان" کے مصداق سیدھا سیدھا انسانی سروں کے گرد لوہے کے کڑے چڑھانا ہے۔

اب ذرا اس بڑے کردار جسے رول ماڈل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس کا حسد، کمینگی اور جھوٹ اور بعدازاں بے حسی کی انتہا نوٹ کیجیے۔ جبکہ بانو قدسیہ محترمہ نے اس پروفیسر سہیل کو genetically mutate کہیں بھی ثابت نہیں کیا ۔ پھر اس مندرجہ ذیل اقتباس سے پروفیسر سہیل کا سنگل ایکٹ پوری کہانی میں گرگ اور المنا کی تصویر پیدا کر گیا۔

یہ یونیورسٹیوں میں پروفیسر حضرات کی طرف سے اپنی طالبات پر غلط نگاہی کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ یعنی ایسے گرگے تب بھی تھے اور شاید پروفیسر سہیل کے آدرش کے موجب

آج بھی زیادہ تعداد میں موجود ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے پروفیسر سہیل کے اپنی شاگرد سیمی شاہ کے لیے جذبات:

"اتنے سارے علم کے باوجود۔۔۔۔اتنی بے اعتنائی دکھانے پر وہ سیمی شاہ میرے دل میں گھستی چلی گئی۔۔۔۔ میرے دل میں اگر علم کا تکبر اتنا نہ ہوتا تو شاید میں اسے لے اڑتا۔ لیکن علم خود ایک حجاب ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے سامنے زانو ٹیک دے گی۔ لیکن ابھی میں اپنے علم کو آگ نہیں لگا سکا تھا کہ آفتاب درمیان میں کود آیا۔ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کوئی عورت پسند کرتی ہے۔۔۔۔تھا نا۔۔۔۔"

تھا۔۔۔سر۔۔۔۔ میں ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

تم سب حیران تھے کہ۔۔۔۔ کہ سیمی شاہ اچانک کالج کیوں چھوڑ گئی اور آفتاب نے اس سے شادی کیوں نہ کی۔۔۔ یہ بات تمہارے لئے معمہ تھی۔۔۔۔اب بھی ہے۔

وجہ میں تھا۔۔۔ میں برا نہیں ہوں۔ devil نہیں ہوں مائی ڈیئر سٹوڈنٹ۔۔ لیکن اتنے سارے علم کے باوجود میں اپنے emotion پر قابو نہ پا سکا۔۔۔۔ ان دنوں میں اس قدر شدید حسد کا شکار ہو گیا کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔۔۔۔ آفتاب مجھ سے بہت متاثر تھا۔ میں طالب علموں کو متاثر کئے بغیر اپنی نوکری کو حلال ہی نہیں سمجھتا۔

مجھے یاد ہے سر۔۔۔ وہ سارا وقت آپ کی مالا جپتا تھا۔۔۔

جیسے تم۔۔۔ مجھ سے متاثر ہو۔۔۔۔ سہیل نے دھواں چھوڑ کر کہا۔

لیکن تم دونوں مجھ سے نہیں میرے علم سے متاثر تھے۔

بس دو شامیں آفتاب نے میرے ساتھ ہوٹل میں گزاریں اور پھر اسے سیمی سے محبت تو رہی لیکن وہ سیمی سے شادی پر رضامند نہ رہا۔۔۔ میں نے اسے بددل کر دیا سیمی سے۔۔۔

آپ نے۔۔۔ آپ وجہ تھے۔۔۔ مجھے وہ ساری باتیں یاد آرہی تھیں جو شادی کے دن آفتاب نے مجھ سے تالاب کنارے کی تھیں۔ وہ ساری گفتگو پروفیسر سہیل کی تھی۔

یہ آپ نے کیا کیا؟ ۔۔۔۔ وہ تو سر سے پاؤں تک وفا تھی سر۔۔۔ اس نے آفتاب کے لیے جان دے دی۔

سہیل نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہا۔۔ ۔ ہاں یہ میں نے کیا قیوم۔۔۔۔ بہت دیر میں اس guilt میں مبتلا رہا ہوں لیکن اب نہیں۔۔۔۔ بہت سے راستے کھلے ہیں مجھ پر اس احساس جرم کا دروازہ کھلنے کی وجہ سے۔۔۔۔ بہت کچھ عطا کیا ہے مجھے اس guilt نے۔"

جنابِ عالی! غور فرمایئے سب سے گھٹیا کردار پروفیسر سہیل بنتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق گرگ کہن یا پھر گرگا تو یہ کردار ثابت ہوتا ہی ہے۔ جو باقی تین کرداروں کی agoney اور اپنی اپنی ذاتوں میں تباہی کا سبب بنا۔ جبکہ مجسمہ منافقت بعدازاں امریکہ جا کر پھر بابوں سے فیض یاب ہو کر ان کے ڈیروں کا لنگر کھا کر پاک صاف ہو جاتا ہے۔ یہاں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بانو قدسیہ محترمہ اس genetically پاک صاف آدمی سے آدمیت کا قتل کروا کے سیمی اور قیوم کو ولدالحرام یا genetically mutate افرادِ معاشرہ پیش کر رہی ہیں۔ بقول سید وارث شاہ:

اَنا اَنت کدوں کہیا سی

میں تے کہیا سی قالُو بلا ناتھا

کہیا ہورنا دا آیا پیش میرے

کہی جھمبڑی نفس بلا ناتھا

پروفیسر سہیل نے ٹھیک وہی کردار ادا کیا جو ہیر وارث شاہ میں کیدو نے ہیر اور رانجھا کی دائمی جدائی کے لیے ادا کیا۔ پیشہ وارانہ اخلاقیات کو پس پشت ڈال کر اپنی شاگرد پر عاشق ہونے والا پروفیسر دو معصوموں اور تیسرے کو قعر مذلت میں پھینکنے والا ازلی شیطان ثابت ہوتا ہے۔ گدھ کی حقیقت یک دم یہاں دھڑام سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔ گرگ، گرگ کہن یا گرگا یا پھر شیطان کی سرشتیں اسی پروفیسر سہیل میں مجسم ظاہر ہو جاتی ہیں۔ لیکن بڑی مہارت سے اور ناول کے تقریباً آخر میں اس راز سے پردہ اٹھتا ہے مگر اس مقام تک پہنچتے پہنچتے قاری مہارت سے لکھی ہوئی یاوہ گوئی کا اسیر ہو چکا ہوتا ہے۔

قیوم:

میں نے جتنے بھی لوگوں کا انٹرویو کیا جنھوں نے راجہ گدھ پڑھا ہوا تھا سبھی کے سبھی قیوم کو راجہ گدھ بنا رہے تھے۔ جب میں نے ان لوگوں کو پروفیسر کے کردار کا تجزیہ پیش کیا تو سبھی پریشان ہو گئے اور جلدی ماننے کو تیار نہ تھے کہ کہانی میں خرابی کی یہ وجہ بھی ہو سکتی تھی۔

قیوم کو ایک دیہاتی بیک گراؤنڈ میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والا کردار دکھایا گیا ہے۔ جس کی شیخوپورہ میں واقع اپنے گاؤں چندرا کی وقتاً فوقتاً فلیش بیک میں کہانی بیان کرنے پر ناول میں طوالت اور چاشنی پیدا ہوتی ہے۔ اسے بالکل ایک ینگ مین

دکھایا گیا ہے مگر اس کی ذہانت یونیورسٹی میں آکر علوم جدیدہ حاصل کرنے کی وجہ سے تیزی سے بڑھتی ہے اور وہ اپنے ماضی کے واقعات کو ان کے درست تناظر میں دیکھنے کے قابل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی اپنی ماں سے محبت تو دکھائی گئی ہے مگر والد کے بارے میں تشکیک کا شکار رہتا ہے۔ بانو قدسیہ محترمہ اسے بھی گھر میں چچا غلام رسول کے رعب و دبدبہ میں دکھاتی ہیں اور پھر اس کی ماں کو بابا بلھے شاہ کے دربار سے قیوم کے والد کے ساتھ بھاگ آنے پر genetically mutate کردار کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

ناول کے شروع میں اس کو بھی عام لڑکوں کی طرح ایک ہم جماعت سیمی شاہ کی وجاہت و رعب و دبدبہ کی وجہ سے محبت میں گرفتار ہوتے دکھایا گیا ہے۔ لیکن جرات کی کمی اور دیہاتی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے وہ مناسب وقت پر اظہار محبت نہیں کر سکتا ہے۔ اُدھر سیمی شاہ پہلے دن سے ہی آفتاب کی ہپ پاکٹ میں جا پہنچتی ہے۔

قیوم کا بطور رقیبِ روسیاہ آفتاب سے حسد کرنا، اس کی اور سیمی شاہ کے ذکر پر چوکنا ہو جانا فطری لگتا ہے چونکہ ناول کی کہانی کا narrator قیوم ہی ہے لہٰذا بانو قدسیہ محترمہ نے اپنا سارا فلسفہ زندگی بہت حد تک اسی کردار کی زبانی بیان کیا ہے۔ قیوم کو ایک بہت ذہین انسان دکھایا گیا ہے جو حالات کے درست تجزیئے کرتا ہے مگر گرگ طبع کے تحت سیمی سے کی ہوئی باتیں نہیں بتاتا۔ اسے سیمی شاہ جھڑکتی اور واضح انداز میں بتاتی ہے کہ وہ صرف اور صرف آفتاب سے محبت کرتی ہے وہ اس کا کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔ اب نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو دو صورتیں سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ سیمی شاہ کی آفتاب سے واشگاف الفاظ میں بیان کی گئی محبت اور بار بار سیمی شاہ کی طرف سے No response کا سائن بورڈ پڑھنے پر قیوم کو اس سے کراہت آمیز نفرت ہو جانی چاہیے تھی۔ وہ اس سے قطع تعلقی کرتا۔ دوسری صورت وہ ہی ہے جو بانو قدسیہ محترمہ نے دکھائی کہ ایک

کمزور، مجبور اور محبت میں مجبوبیت کی حد تک پسی ہوئی لڑکی کا استحصال کرے۔ یعنی اسے محبت وجبت تو نہ رہے مگر کسی طرح اپنی نفسیاتی ٹھیس کا بدلہ لے۔ یہاں وہ ہمیں حقیقی گرگ کہن یا پھر گرگا کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اسے دکھایا گیا ہے کہ وہ سیمی شاہ کے لیے محبت و ہمدردی بھی ظاہر کرتا ہے مگر اپنی دھتکاری ہوئی محبت کا انتقام سیمی شاہ کا جنسی استحصال کر کے لیتا ہے۔

پھر پروفیسر سہیل کی شہ پر تانترک یوگا کی آڑ میں گھر آئی مہمان کو بھی گندہ کر دیتا ہے۔ لیکن وہاں وہ فوری طور پر صورتِ حال کو سمجھ جاتا ہے اور عابدہ کو مزید تانترک پر مجبور نہیں کرتا۔ پہلے محبت کی ناکامی اور پھر سیمی شاہ اس کو روحانی طور پر توڑ کے رکھ دیتی ہے اور وہ دائمی جسمانی عارضوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں تو عشق لا حاصل کا چاروں بنیادی کردار شکار ہو جاتے ہیں مگر متاثرین میں سے سب سے زیادہ اذیت اور بے سکونی قیوم کے حصے میں آتی ہے۔ یہاں پھر ہم بانو قدسیہ محترمہ کی کج فہمی یا تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ دیکھتے ہیں۔ انسانوں کو انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ عشق نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن شریف میں کہیں بھی لفظ عشق نہیں ہے۔ البتہ صوفیا کے نزدیک عشق کا جذبہ انسان میں تب ہی پیدا ہوتا ہے جب انسانی روح اس جسم کے اندر قید ہو جاتی ہے اور جب قلب اس کی اپنے منبع سے یعنی رب تعالیٰ جسے صوفیا روح کل قرار دیتے ہیں، سے جدائی کا ادراک حاصل کرتا ہے تو تڑپ پیدا ہوتی ہے اسے عشق قرار دیا گیا ہے۔ اب سمجھ گئے ہونگے جس انسان کو یہ ادراک اور آگہی حاصل ہو جائے تو وہ نہ صرف اپنے جسم کو زنداں بلکہ ساری مادی دنیا کو مایا جال سمجھنے لگ جاتا ہے۔ کسی عورت یا دنیاوی مال و متاع کی کیا وقعت سمجھے گا۔ لہٰذا بانو قدسیہ محترمہ نے 1981ء میں محض 32% پڑھے لکھے پاکستانیوں میں عشقِ لا حاصل کا شوشہ چھوڑ کر انہیں اُلّو بنایا۔ صوفی وسالک کا عشق۔۔۔ عشق لا حاصل نہیں ہوتا وہ اپنے زہد وتقویٰ کی وجہ سے پاکیزگی اور خلوص نیت کے اُس

درجہ پر جا پہنچتا ہے کہ وہ نروان پا جاتا ہے۔ اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ انسانوں سے چاہت ،لگاؤ، انس یا پھر محبت ہو سکتی ہے عشق لا حاصل جیسی کوئی چیز نہیں ۔ ہمارے معاشرہ میں خود بانو قدسیہ محترمہ اور اشفاق احمد خان مرحوم کی جوڑی ایسی محبت جیسے جذبے کے نتیجہ میں وجود میں آئی (دیکھئے راہ رواں)۔ فلم سٹار محمد علی زیبا، محترمہ نیلو اور شاہد، محترمہ ثمینہ اور عثمان پیرزادہ اس کے علاوہ لاکھوں شادیاں اسی محبت کے تحت معرض وجود میں آتی ہیں ۔ خود قیوم کے والدین کی شادی بھی ایک instant love کا نتیجہ تھی۔ بانو قدسیہ محترمہ نے اس ناول میں کئی جگہ غلط تھیوریاں پیش کر کے نسلوں کو گمراہ کرنے کی سعی کی ہوئی ہے۔ انسانوں کے درمیان محبت جیسے شاندار جذبے کو عشق لا حاصل کہہ کر تنقیص کی حد کر دی گئی ہے۔ ان کی رزق حرام وحلال کی تھیوری خالصتاً من گھڑت ہے اور گندم کے دانہ کو وجہ genetic mutation قرار دینے پر سیر حاصل بحث اس کے متعلقہ باب میں آئے گی۔

یہاں ہمارا مقصد قیوم کے کردار کا تجزیہ ہے۔ قیوم امتل سے مل کر اپنے نظریات میں تبدیلی لاتا ہے۔ لیکن اسے مطلب پرست انسان سے یکدم ولایت کے درجہ پر پہنچتے دیکھتے ہیں جب اس کی روشن نامی باکرہ لڑکی سے شادی ہوتی ہے اور پہلی رات اس کے علم میں آجاتا ہے کہ وہ باکرہ نہیں بلکہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ یہاں پر قیوم یکدم اپنی گرگا شرست چھوڑ کر درویش بن جاتا ہے۔ روشن کو چھوتا بھی نہیں ۔ بلکہ اس کے عاشق سے رابطہ کرواتا ہے اسے سعودی عرب سے واپس بلواتا ہے۔ اور چپکے سے روشن کو طلاق دے کر روشن کا نکاح اس کے عاشق سے کروا کے تہی دامن ائرپورٹ سے واپس آجاتا ہے۔ لیکن قیوم کا عرفان ذات تب مکمل ہوتا نظر آتا ہے جب وہ لندن سے واپس ہوئے آفتاب سے ملتا ہے اور اس کے بچے کی بیماری کے متعلق وہ سند عطا کرتا ہے جو بڑے بڑے ماہرین نفسیات اور خود والدین بھی اندازہ نہیں لگا سکے ہوتے۔ قیوم

اس کی دیوانگی کو مثبت قرار دیتا اور super genetic mutation کی تشریح کرتا ہے۔
اور یہ ناول کی تقریباً اختتامی سطور میں ہوتا ہے۔
ملاحظہ فرمایئے۔۔۔

''دیوانہ پن بھی دو طرح کا ہے۔ ایک پاگل پن کی وہ قسم جس سے روح، قلب، دماغ سب کمزور ہوتے ہیں۔۔۔۔ دوسرا دیوانہ پن وہ ہے۔۔۔۔ جس سے روح میں توانائی آتی ہے۔ وہ ایک ہی جست میں کئی کئی منزلیں پار کرتی ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر یقین کرو۔۔۔۔ تمہارے بیٹے کا دیوانہ پن دوسری قسم کا ہے۔ میرا ایمان ہے۔''

لیجئے جناب یہاں پر قیوم صاحب کو بانو قدسیہ محترمہ نے عرفانِ ذات کے اونچے درجہ پر فائز کر دیا ہے۔ اتنے traumatic واقعات کے بعد قیوم کے کردار کو تو super normal پر لے گئیں اور سیمی شاہ جس نے ریڈیو پر بھی جانا شروع کر دیا تھا اسے موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔ کرداروں کو نیچرل سے abnormal کرنا اور abnormal سے نارمل کرنا تو کوئی بانو قدسیہ محترمہ سے سیکھے۔ جہاں جہاں ممکن ہو سکا انہوں نے ڈکٹیٹر شپ کے گھٹن زدہ ماحول میں عوام الناس کو normal course of action سے ہٹا کر لوری نما میٹھی نیند سلانے کی کوشش کی ہے۔

امتل:

ناول میں مختصر دورانیے کے لیے یہ کردار سامنے آتا ہے۔ امتل ایک سابقہ sex-worker پلس گلوکارہ دکھائی گئی ہے جو اب ڈھلی ہوئی عمر میں اور پھٹی ہوئی آواز کے ساتھ ریڈیو سٹیشن کام لینے چلی آتی ہے۔ وہ ایک بولڈ کردار اور منجھی ہوئی سوچ کی

حامل عورت ہے۔ امتل کے کردار میں بانو قدسیہ محترمہ نے ناول کے اندر ایک ناولٹ پیدا کر دیا ہے۔ اس کی زبان سے حرام وحلال کا اتنا بار بار ذکر کروایا ہے کہ باقی ناول لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ امتل اپنے مخبوط الحواس بیٹے کے ذکر پر کہتی ہے ہم تو نارمل بچے پیدا کر ہی نہیں کر سکتے۔ اب اگر sex workers دیوانے پاگل ہی پیدا کرتیں چونکہ بقول بانو قدسیہ محترمہ ان کی رگوں میں نسل در نسل گندہ خون ہی ہوتا ہے تو اس صورت میں تمام شاہی محلہ کوئی صدی دو صدی پہلے ہی خود بخود ختم ہو چکا ہوتا یا پاگل خانے کی شکل اختیار کر لیتا۔ امتل کا انجام باغِ جناح میں نوگزے کی قبر اور بابا ثرت مراد اور شاہ جمال کے مزار پر دعا کے بعد اپنے ہی مخبوط الحواس بیٹے کے ہاتھوں قتل میں دکھایا گیا ہے کہ اس کی آخری دعا ہوتی ہے یا اللہ کسی اپنے کے ہاتھوں میں مرنا نصیب ہو۔

چچا غلام رسول:

ہمیں قیوم کی زبانی ہی علم ہوتا ہے کہ چچا غلام رسول ان کے گھر میں ایک سردار کی طرح رہتا تھا۔ کہاں سے آیا؟ قیوم کے والدین کیوں اس سے ڈرتے ہیں؟ اور وہ منہ پھٹ کیوں تھا؟ جو دل مین آتا ہے بولتا جاتا ہے۔ اس کی موت کیسے واقع ہوتی ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔ لیکن ایک اشارہ واضح ملتا ہے کہ اس کے کردار کی وجہ سے ایک ہنستا بستا گاؤں کلرزدہ ہوتا چلا گیا۔ قیوم اپنے والد کو آخری بار جب ملنے جاتا ہے تو اسے خدا جانے راجہ گدھ سے کیوں تشبیہہ دیتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس ناول میں بانو قدسیہ محترمہ نے جہاں مختلف قوموں کی عورتوں کو dissuss کیا ہے وہیں اس نے راجپوتوں کو بھی genestically mutated بنایا ہے۔ اس بات کا انہیں کہاں ادراک یا تجربہ ہوا یہ وہ ہی بہتر جانتی ہیں۔ آرائیوں کو تو وہ برا کہہ نہیں سکتی تھیں کیوں کہ ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق آرائیں تھے اور انکی ایک بیٹی تو باقاعدہ abnormal بھی تھیں۔ ناول میں چچا غلام

رسول کو بعد از موت ایک گدھ کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ جب قیوم اپنے گاؤں چندرا سے واپسی پر ٹرین میں سوار لاہور واپس جا رہا ہوتا ہے تو ایک گدھ دور درختوں سے اڑ کر قیوم کے ریل ڈبے کی کھڑکی کے ساتھ ساتھ اڑتا ہے اور ساتھ گاتا ہے۔

دنیا داراں دے گھر دیندا بیٹے ولی الٰہی
ولیاں دے گھر پیدا کردا میرے وانگ گناہی

لیں جناب! یا تو یہ یا وہ دُرفطنی بانو قدسیہ محترمہ نے بابا یحییٰ کے ''پیار رنگ کالا'' سے لی جس میں انہوں نے صابر سنگھ کا عشق میں کالا کتا بن کے محبوبہ کے بنگلے کے گرد چکر کاٹنا اور پھر بابا یحییٰ کے حضور پیش ہو کر بھونکتے بھونکتے یہ کہنا کہ بابا جی میں آپ کا کتا صابر سیہاں۔ عجیب لا یعنی غیر منطقی منظر کشی دونوں میں سے کسی ایک کی ایجاد ہے اور دوسرے نے آئیڈیا چوری کیا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ باغِ جناح میں نوگزے کی قبر سے پر اسراریت کو منسلک کرنا۔ پھر جھاڑیوں سے ایک چمکتا ہوا نوگزا برآمد ہونا بمعہ اپنے بھتنے نما چیلوں کے۔ بانو قدسیہ محترمہ کے ذہن کی اختراع ہے اور 1981ء کی عوام الناس کو بیوقوف بنانا مقصود ہوگا۔ کیونکہ نہ پہلے نہ ہی بعد میں کبھی اس نوگزا آدمی نما مخلوق کی کوئی رپورٹ پولیس یا انتظامیہ کے پاس آئی اور نہ ہی اخباروں میں کبھی ایسا کچھ رپورٹ ہوا۔ ہاں البتہ C-121 داستان سرائے ماڈل ٹاؤن کے کسی چاہنے والے نے ایک بورڈ کافور کے درخت پر لگا دیا تھا جس پر لکھا تھا یہ وہ درخت ہے جہاں سیمی شاہ اور قیوم راتوں کو ملا کرتے تھے۔ جو بعد ازاں انتظامیہ نے وہاں سے وارننگ کے ساتھ اتارا تھا۔

چندرا گاؤں:

قیوم وقتاً فوقتاً فلیش بیک میں جا کر شیخوپورہ میں واقع اپنے گاؤں چندرا کا ذکر کرتا ہے۔ وہاں مائی توبہ توبہ کا پراسرار کردار دکھاتا ہے۔ یعنی بانو قدسیہ محترمہ کو مافوق

الطبع ہستیوں کا Obsession ہے۔ پھر چندرا ہی میں قیوم اپنے کھلنڈرے دوست عزیز گاتن اور اسکی ماں کی تصویر کشی کرتا ہے جس کے مطابق وہ تندور پر روٹیاں لگانے والی ماچھن گاؤں کے تمام مردوں کی love-lady ہوتی ہے۔ پھر عزیز گاتن اور اس کی ماچھن ماں کی پراسرار گمشدگی کی وجہ کی وضاحت نہیں کی۔ ہاں کہانی کے اشارے بتاتے ہیں کہ گاتن تو خود کہیں غائب ہو جاتا ہے چچا غلام رسول کی اپنی ماں کے بارے میں فحش گفتگو سن کر جبکہ ماچھن کو شاید قتل کر کے کہیں سیم نالہ میں پھینک دیتا ہے۔ اور اس کے بعد چندرا گاؤں کو تیزی سے کلر لگنا شروع کر دیتا ہے۔ غیر ازدواجی تعلقات اور کنجریوں کے قتل شاہی محلّہ میں پانچ سو سال سے عام معمول رہے ہیں مگر نہ تو شاہی قلعہ اور نہ ہی شاہی مسجد اور شہر لاہور کو کسی کلر نے لگا۔ چندرا کی کلر زدگی کے ہاتھوں مکمل نابودی پر میں نے محکمہ زراعت سے رجوع کیا۔ ماہرین نے بتایا کہ جس گاؤں کے پاس سے سیم نالہ بن چکا ہو وہاں پہلے سے موجود کلر و سیم و تھور ختم ہو جاتے ہیں اور ماڈرن زمانے میں آباد زمینوں پر کلر سیم و تھور آنے کے اندیشہ کے تحت محکمہ زراعت فوراً حرکت میں آتا ہے اور اس کا سدّ باب کر لیا جاتا ہے۔ البتہ! کلر زدگی کے ایسے واقعات خال خال رونما ہوتے ہیں جن علاقوں میں انڈسٹریل فضلات و فاضلات کی concentration ہو جائے۔ مگر چندرا کے اردگرد کسی بھی انڈسٹری کا ہونا ناول میں نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا چندرا کو مکمل طور پر کلر زدہ اور نیست و نابود کر دینا بانو قدسیہ محترمہ کی زبردست lack of observation کو ظاہر کرتا ہے۔ جہاں آپ محترمہ نے انسانی کرداروں اور گدھ کی wrong depiction کے ذریعے غلط کردار نگاری کی وہیں پہ چندرا کی تباہی بھی غلط منظر نگاری مانی جائے گی۔ مثلاً کوئی ادیب صحرا میں کنو مالٹے یا سیب کے درخت اگتے دکھائے اور جب پوچھا جائے صحرا میں یہ درخت نہیں پنپ سکتے تو وہ جواب دے جناب یہ فکشن ہے۔ تو ہم اسے مصنف کی کم علمی اور ڈھٹائی پر محمول کریں گے۔

○

باب 5

حرام وحلال کا قرآنی نظریہ بمقابلہ راجہ گدھ

کوئی بھی تھیوری یا نظریہ اُن حالات و واقعات کی تفصیلی تشریح ہوتی ہے جو کسی خاص چیز کے وجود یا حقائق کو ثابت کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ پھر جب وہ تھیوری تجربات کی سان پر چڑھ کر اگر اپنے پیش کردہ نظریات کا اثبات کر دے تو اسے قانون کا درجہ عطا کر دیا جاتا ہے۔ ناول راجہ گدھ میں بانو قدسیہ محترمہ نے بالکل ہی غیر مصدقہ اور بے سروپا اور من گھڑت تھیوری پیش کی تھی جو آج 35 سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی جوں کی توں من گھڑت ہی ہے۔ ایک مصنف کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریات کسی ادبی پارہ کے ذریعے پیش کرے اور قاری کا حق ہوتا ہے کہ ان میں وہ شگاف تلاش کرے جو اس نظریہ کی غیر مضبوطی کا سبب بن رہے ہوں۔ اس لئے یہاں میں بطور ایک قاری اپنا حقِ تنقید استعمال کرتے ہوئے مصنفہ محترمہ کی طرف سے دیئے گئے اسلامی و غیر اسلامی حوالہ جات کو اپنے علم اور مصدقہ قرآنی ذرائع سے دوبارہ امتحان سے گزاروں گا۔

i) شجر ممنوعہ اور اس کا استعمال اور مابعد اثرات:

راجہ گدھ کے 31 ویں ایڈیشن مطبوعہ 2013ء صفحہ 277 پر مصنفہ محترمہ نے گندم کو حضرت آدمؑ اور حواؑ کے جینز میں منفی تبدیلی کا سبب قرار دیا ہے۔ اگر ہم قرآنی حوالوں سے اس مفروضہ پر غور کریں تو مصنفہ محترمہ کی طرف سے بہت ساری غلط خیالی کا اظہار

ہوتا ہے۔ اس بابت قرآن پاک میں سب سے پہلے سورۃ البقرہ کی آیت 35اور 36 میں کچھ یوں ہے:

''اور کہا ہم نے آدم سے رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں اور کھاؤ پیو جہاں سے چاہو لیکن قریب نہ اس درخت کے جانا ورنہ ہو جاؤ گے ظالموں میں سے (35)۔ پس بھٹکا دیا ان کو شیطان نے اس (درخت) کی ترغیب دے کر اور نکلوا کر چھوڑا اس سے جس میں وہ تھے (جنت) اور کہا ہم نے ان سے کہ اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ کہ ہو تم ایک دوسرے کے لئے دشمن اور ہے تمہارے لیے زمین میں ٹھکانہ اور گزر بسر کرنے کے لیے سامان ایک مقررہ مدت تک (36)''

اسی طرح سورۃ الاعراف کی آیت 19 بھی بالکل سورۃ البقرہ کی آیت 35 والا حکم ہی دہراتی نظر آتی ہے۔ جبکہ آیات 20,21,22,23,24 اور 25 مابعد کے حالات بیان کرتی ہیں:

''پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کا پردہ بدن جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو پردہ کرے اور کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس کے کہ تم دونوں کہیں فرشتے نہ ہو جاؤ یا کہیں ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو نہ جاؤ (20) اور ان دونوں کے روبرو قسم کھالی کہ یقین جانیے میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں (21) سو ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا۔ پس جب ان دونوں نے اس درخت کو چکھا دونوں کا پردہ بدن ایک

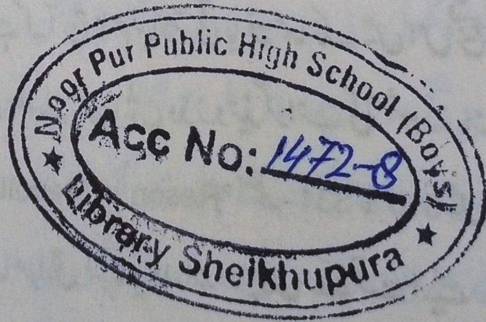
دوسرے کے روبرو بے پردہ ہو گیا اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑ جوڑ کے رکھنے لگے اور ان کے رب نے کہا کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے ممانعت نہ کر چکا تھا اور نہ کہہ چکا تھا کہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے (22)۔

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا ہے اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہمارے اوپر رحم نہ کرے گا تو واقعی ضرور بر ضرور ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے (23)۔حق تعالی نے فرمایا کہ نیچے ایسی حالت میں جاؤ کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ ہے اور نفع حاصل کرنا ایک وقت تک (24)۔

قدماء سے تفسیر ابنِ کثیر اور جدید دور میں تفہیم القرآن (مولانا ابو اعلی مودودیؒ) میں بیان ہے کہ قرآن کی کوئی اور آیت یا مصدقہ حدیث ایسی نہیں ملتی جس سے ثابت ہو وہ کون سا درخت تھا جس کے پاس جانا اور پھل کھانا منع تھا۔ ویسے بھی گندم کا پودا ہوتا ہے یہ کسی درخت پر نہیں لگتی۔ شجر ممنوعہ میں سیب ، انگور اور گندم یہودی عیسائی روایات سے پتہ چلتا ہے مگر اسلامی اور قرآنی تناظر میں ہرگز ثابت شدہ نہیں ہے۔ سورۃ الاعراف میں آیت 20 تا 24 کے مطابق بطور سزا عرش سے فرش پر پھینکا گیا اور ان آیات مقدسہ میں حرام وحلال یا پھر نسل انسانی کے لئے اسی درخت کا پھل قیامت تک کھاتے رہنا کوئی حکم نہیں ٹھہرتا۔ مولانا مودودیؒ اپنی شہرہ آفاق تفہیم القرآن میں سورۃ البقرہ آیت 35اور 36 کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ آدم کو اس شجر ممنوعہ کے قریب نہ جانے کا حکم آدم کا امتحان مقصود تھا کہ وہ احکامات الٰہیہ میں کس قدر اطاعت وشکر گزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں نہ کہ اس درخت اور اس کے پھل میں کوئی نقص تھا۔

اب بانو قدسیہ محترمہ کا مفروضہ (جبکہ تھیوری تو مفروضہ غلط ہوتے ہیں آگے بڑھ ہی نہیں سکتی) کہ گندم کا پہلا لقمہ کھاتے ہی نسل انسانی کے لہو میں جینز تبدیل ہو گئے تھے بالکل غلط ٹھہرتا ہے۔ انہوں نے صفحہ 277 پر حرام وحلال کی تشریح کی ہے مگر شجر ممنوعہ کو اسکے درست الہیاتی تناظر میں سمجھنے سے قاصر رہی ہیں۔ ہمارا مقصد ان کے لیے کوئی فتوی جاری کرنا نہیں بلکہ ان کی غلط فہمی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ پھر ہم واضح دیکھتے ہیں کہ آدم وحوا کو راہ حق سے بھٹکانے کے لئے حق تعالی شیطان لعین کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں جو اس نے آدم حوا کو بھٹکایا اور وہ اپنی فرمانبرداری میں ناکام رہے۔ پھر ٹھیک اگلی آیات میں توبہ کی زبردست اہمیت بیان کی گئی ہے۔ آدم وحوا کی حقیقی احساس پچھتاوا اور معافی مانگنے پر حق تعالی نے انہیں معاف بھی فرما دیا تھا۔ اب بانو قدسیہ محترمہ نے رزق حرام کھانے والوں پر محض تباہی و بربادی کی حد لاگو کر دی اور توبہ واستغفار کے ذریعے رحمتِ الہی کے جوش میں آنے کو گول کر گئی ہیں۔

○



باب 6

غلط نظریہ ارتقاء و Genes Mutation Theory

بانو قدسیہ محترمہ کے ناول کی ساری کہانی نگاری اسی ایک تھیوری کو ثابت کرنے کے لیے کی گئی۔ ان کا پورا زور لگا ہے اس بات پر مگر اُس وقت (1981ء) کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف 32 فیصد پڑھی لکھی عوام میں سے کوئی بھی نہ دیکھ سکا کہ مغرب میں بالعموم مگر امریکہ اور برطانیہ میں بالخصوص ایسے ماہرین نفسیات و ماہرین حیاتیات کی حکومتی سطح پر پذیرائی ہو رہی تھی جو ایسی تحقیقات کر رہے تھے جن کے تحت انسانوں کی برتری یا کمتری ان کے رنگ اور نسل کے ساتھ منسلک ہو۔ ایسے ماہرینِ نفسیات کے ماڈلز سرکاری سطح پر یونیورسٹیوں میں لاگو کروائے جا رہے تھے جن میں ہم جنس پرستی کو انسانوں کے لیے بے ضرر بلکہ فائدہ مند قرار دیا جا رہا تھا انہی جعلی تحریکات کا نتیجہ ہے کہ آج نام نہاد ترقی یافتہ ممالک میں اس قبیح فعل کو قانونی تحفظ میسر آتا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایلن وڈز و ٹیڈ گرانٹ کی مشہور زمانہ زبردست تحقیقی کھوجوں پر مشتمل کتاب "Reson in Revolt" صفحہ 331 تا 510 میں انتہائی مُدلل اور تفصیلی انداز میں ایسی ہی سامراجی سرمایہ دارانہ سوچوں کے تحت ایسے بے سروپا علوم پر تکیہ کرنا اور عوام الناس کو ایک ذہنی و نفسیاتی غلامی و بیماری میں مبتلا رکھنے کے عملی ہتھکنڈوں کو وضاحت و صراحت سے عیاں کیا گیا ہے۔ اس میں سے آپ کے لئے بالکل متعلقہ پیرا گراف کے اقتباسات پیش کرتے ہیں:

صفحہ 477:

"یہ بات فیصلہ کن طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ Aquired traits (ایسی عادات وخواص جو انسان اپنے ماحول سے اخذ کرتا ہے) حیاتیاتی طور پر منتقل نہیں ہو سکتیں۔ کلچر ایک نسل سے دوسری نسل تک صرف اور صرف تعلیم اور مثال کے ذریعے منتقل ہوتا ہے۔"

صفحہ 479:

"یہ بات سمجھنے کے لئے زیادہ ذہانت درکار نہیں کہ اگر آئن سٹائن نیو یارک کی کسی گندی بستی یا ہندوستانی گاؤں میں پیدا ہوتا تو اس کی جینیاتی صلاحیت کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا۔"

صفحہ 481:

"اگرچہ اس سے زندگی میں کارفرما عوامل کے مادہ پرستانہ اور جدلیاتی کردار کا واضح طور پر مظاہر ہو جاتا ہے پھر بھی جینیات نے گرما گرم بحث کو فروغ دیا ہے اور خیال پرستی اور رجعت پسندانہ تصورات کے لیے دروازہ کھول دیا ہے۔ جینیات کا یکطرفہ فیشن لامحالہ غلطی اور انتشار پر منتج ہوتا ہے۔ اس طرح بعض ماہرین جینیات حیاتیاتی جبریت یا جینیاتی جبریت کے جال میں پھنس گئے ہیں اور رچرڈ ڈاکنز جیسے ماہرین سماجی حیاتیات کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔"

صفحہ 482:

"ارتقاء کے سلسلے میں سادہ لوحی اور نا پختگی پر مبنی محاوروں مثلاً "survival of filtest" اور "struggle for existance" نے

ہربرٹ سپینسر کے ذریعے ڈارون ازم کی لغات میں جگہ بنالی۔ انہیں سرمایہ داری اور استحصال کا جواز مل گیا۔"

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہمدردی کی سوچ پر بننے والا I.Q Test بھی جو کہ الفریڈ بنیٹ نے تیار کیا تھا تا کہ طالب علموں میں کمزوریوں کی نشاندہی کر کے ان کی پڑھائی میں مدد کر کے انہیں قابل بنایا جا سکے۔ لیکن لوئس ٹرمین نے اس Birt test یعنی I.Q Test کو امریکی سامراجیت کو طاقت بخشنے کے لئے امریکہ میں لاگو کر کے تمام ہسپانویوں، ریڈ انڈین اور کالے لوگوں کو نسلاً نالائق اور مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے قرار دے کر ان کے خلاف امتیازی سلوک کا پروانہ جاری کر دیا۔ اسی I.Q Test کو برطانیہ میں جنون پرستوں کے ترجمان انگریز ماہر نفسیات سر سائرل لوڈ ووک پرٹ نے لاگو کر کے فرمانا شروع کر دیا کہ مرد عورتوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں اور پھر سائنسی (بانو قدسیہ محترمہ جیسی تھیوری پر مبنی) طور پر چیلنج کیا کہ عیسائی یہودیوں کی نسبت زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ پھر کہا انگریز آئرش لوگوں کے اعلی طبقات سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ انگلینڈ میں یہ ٹیسٹ تو سر سائرل کے ہاتھوں یوں لگے جیسے بندر کے ہاتھ میں استرا۔ انہوں نے ان کو استعمال برائے اصلاح نہیں بلکہ استعمال برائے امتیاز خوب استعمال کیا۔ اسی کتاب Reason in Revolt میں مصنف صاحبان نے ثابت کیا ہے کہ ایسے سرمایہ داری کے پٹھو نما ماہرین نفسیات وحیاتیات نے باقاعدہ جعلی اعداد وشمار پیش کئے اور عوامی ادب کے ذریعے لوگوں میں اس خیال کو ترویج دے کر احساس کمتری یا احساس برتری پیدا کرنے کی مذموم کوششیں بھی کیں۔

صفحہ 492:

"یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس کی بنیاد انسان کے استحصال اور منافع کی زیادہ سے زیادہ شرح کے حصول پر ہے اور بڑے پیمانے

پر بے روزگاری، غربت، رسوا کن زندگی اور بے گھر لوگوں کا
باعث بنتے ہیں اور پھر جولباً یہ سماجی حالات جرم، تشدد اور بے رحمی
پیدا کرتے ہیں۔ اس کا تعلق جینز یا حیاتیات سے بالکل نہیں بلکہ
اس کی ساری وجہ سرمایہ دارانہ بربریت پر ہے۔''

اب بانو قدسیہ محترمہ اور اشفاق احمد مرحوم اردو سائنس بورڈ کے کرتا دھرتا تھے۔ انہیں انگریزی سے اردو میں تراجم کے لیے مترجمین کی پوری سہولتیں حاصل تھیں۔ انہوں نے غالباً 1975ء میں ڈاکٹر رچرڈ ڈاکنز کی انتہائی متنازعہ کتاب ''خودغرض جین'' (the selfis genes) سے استفادہ کیا اور بعدازاں شاہی ادبی ٹولہ کے سرخیل بننے کے لیے راجہ گدھ میں اس انتہائی غیر سائنسی اور استحصالی نظریہ پر اپنی طرف سے رزق حرام و حلال کا اضافہ کر کے اس مغربی خیالِ جبر و استبدادیت کی ایک نئی شکل پیش کرنے کی کوشش کی۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگ بقول عمران شاہد بھنڈر (مابعد جدیدیت اور امتزاجی تنقید) آغا وزیر نے اپنی زیادہ تر تحقیقات و تنقید مغربی لکھاریوں سے صریحاً سرقہ کر کے لکھی۔ اب یاد رہے کہ آغا وزیر کی زیادہ تر کتابیں اردو سائنس بورڈ سے ہی چھپتی رہیں۔ پھر عمران شاہد بھنڈر پاکستانی محققین کے بارے میں صفحہ 11 پر یوں رائے زنی کرتے ہیں:

''مابعد جدیدیت پر لکھنے والے اردو کے 'ناقدین' کا سرے سے
بنیادی المیہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ ہی مغربی
جامعات سے تربیت حاصل کی ہے کہ جس سے انہیں جامعات
کے نصاب میں مابعد جدید تھیوری کی حقیقت کا ادراک ہو سکے اور
نہ ہی یہ لوگ مغربی معاشروں میں رہے ہیں کہ وہاں کی ثقافتی
اشکال اور سماجی رویوں کا ہی باریکی سے مشاہدہ کر سکیں۔ بیشتر کا

علم ثانوی ذرائع سے ماخوذ ہے، جو خطرناک حد تک گمراہ کن ثابت ہوا ہے۔"

گو کہ مندرجہ بالا اقتباس میں ادبی تنقید کی طرف اشارہ ہے مگر ایک اصول ضرور متعین ہو رہا ہے کہ ہمارے ادیب بھی جدیدیت سے متاثر ہو کر خود جدید تناظر میں ادب بارے لکھ رہے ہیں۔ یہاں اس اصول کے تحت بانو قدسیہ محترمہ کی تھیوری حرام و حلال اور اس سے gene mutation منفی یا مثبت بھی مغرب کی طرف سے مستعار لی گئی نیم پختہ ہے اور عوام الناس میں احساس کمتری اور پھر غلط رویوں کو اختیار کرنے کی طرف لے جانے والی ہے۔

یہاں ایک بات اور بھی زیرِ غور آسکتی ہے جو ادیب اپنی کتابیں سرقہ کر کے اور دوسروں سے آئیڈیاز چوری کر کے لکھے تو ان کتابوں سے کمائی دولت کون سے رزق میں شمار ہوگی۔ خود بانو قدسیہ محترمہ اپنے افسانوں کے مجموعہ "دست بستہ" میں "مفتی جی خیمہ ساز" میں ممتاز مفتی کا خاکہ لکھتے ہوئے فرماتی ہیں صفحہ 130:

"ان سے میری آخری بحث سیب کے درخت پر ہوئی تھی۔ سن اسی کے شروع میں میری کوتاہی، کمزوری، تساہل پسندی نے مجھ میں ایک خاص قسم کا فرار پیدا کر دیا تھا۔ میں نے پہلے ٹیلی ویژن کو خیر باد کہا پھر آہستہ آہستہ لکھنے لکھانے سے مکمل انحراف اختیار کر لیا۔ مفتی جی سے میرا یہ ڈپریشن برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجھے کہتے۔۔۔ "تو سیب کا درخت ہے تجھے سیب ہی لگتے رہیں تو ٹھیک ہے۔ تو کس وخت میں پڑ گئی ہے۔"

"مفتی جی سیب کا درخت کبھی کبھی بانجھ بھی ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ سال بارش نہ ہو تو باغ سوکھ جاتے ہیں۔" "درختوں کی کیا مجال ہے؟" مفتی جی بھڑک اٹھتے۔ میں چپ رہی۔ میں انہیں بحث

میں بہت دور لے جاتی ۔ وہ جو کلے ٹھونکنے ، رسیاں کھینچنے اور شامیانہ کھڑا کرنے کے ماہر تھے بحث میں ہار جاتے۔۔۔۔۔"

اب ذرا ملاحظہ فرمایئے 1980ء میں بانو قدسیہ محترمہ 52 سال کی ہو چکی تھیں اور لکھنے لکھانے سے بیزار تھیں ۔ مفتی جی بھی زور لگا کے ہار گئے ۔ آپ بحث میں جیت گئیں پھر یکدم 1981ء میں لگ بھگ 600 صفحات پر مشتمل راجہ گدھ ایک دم کیسے لکھ ڈالا؟ آپ نے 13 دسمبر 2015 کو ڈان اخبار میں انٹرویو ریکارڈ کرواتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں نے روزانہ صبح 11:30 سے 2 بجے تک لکھ لکھ کر 50 دنوں میں یہ ناول مکمل کر لیا تھا ۔ جبکہ ان دنوں آپ لکھنے پڑھنے سے مکمل انحراف کر چکی تھیں!!!! اس پر تنقید یا کھوج کا میدان میں کسی اور دوست پر چھوڑتا ہوں۔

ہم یہاں gene کی مزید تشریح کے لئے اہلِ علم کو gene کے مجموعہ genome اور پھر جینو ٹائپ اور فینو ٹائپ کی طرف اشارہ دے دیتے ہیں ۔ انسانی کردار و ساخت پر ساری جدید ترین تحقیقات سامنے آجائیں گی۔

راجہ گدھ میں بانو قدسیہ محترمہ صفحہ 277 پر ہی فرماتی ہیں کہ پہلے دن سے آدم کا کھایا ہوا گندم کا دانہ قیامت تک کے لئے اس میں حرامی خون کا سبب بن گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر رزق حلال کا اثر آ ہی نہیں سکتا ۔ پھر آپ نے صفحہ 279 پر لکھا ہے کہ ولد الزنا میں gene mutation کا زیادہ چانس ہوتا ہے۔ اب بتایئے روح منجانب اللہ ہے۔ پیدا ہونے والا بچہ بذاتِ خود معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔

بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بانو قدسیہ محترمہ مغرب سے متاثر ہو کر بس فتویٰ دینا جانتی ہیں مگر دانشمندانہ تحقیق کے گہرے دریا میں اتر کر تمام پہلوؤں سے انسانی کردار پر اثر انداز ہونے والے عوامل سے تجاہل عرفانہ سے کام لیتی ہیں ۔ تمام انبیاء کرام سے لیکر جدید مصلحین، ولی، بزرگ اور گیانی سب کے سب سماجی معاشرے کی اصلاح اور سوچ کو درست کرنے کا درس دیتے آئے ہیں تا کہ انسانوں میں حرام کمانے اور غیر قانونی

جنسی تعلقات جیسے شخصی عوامل پیدا ہی نہ ہوسکیں۔

اب ذرا تجزیہ کرتے ہیں اُن لوگوں کا جن کا تذکرہ ہوا کہ ایک خاص رزق یعنی من وسلویٰ کھانے والے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنے ناول میں یہودیوں کی تعریف کی ہے کہ ان میں ذہانت عام انسانوں کی نسبت زیادہ بیان کرتی ہیں یعنی جنت سے آیا ہوا کھانا۔ لیکن جب بنی اسرائیل نے اس کھانے کو کھانے سے انکار کردیا اور دال ساگ وغیرہ اللہ سے مانگ لیا تو ان پر اس خاص رزق کا سلسلہ بند ہوگیا۔ مگر ان کے کردار کیسے ہو گئے یا پھر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان پر اس رزق کا کوئی مثبت اثر نہ آیا۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

سورۃ البقرہ آیت 57,58 ''اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارا (اور کہہ دیا) کہ ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ انہوں نے ہم پر تو ظلم نہ کیا البتہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ اور ہم نے تم سے کہا کہ اس بستی میں جاؤ اور جو کچھ یہاں چاہو بافراغت کھاؤ پیو اور دروازے میں سے سجدے کرتے ہوئے گزرو اور زبان سے حِطَّۃٌ کہو ہم تمہاری خطائیں معاف فرما دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے۔''

اب ملاحظہ ہو آیت 61:

''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم سے ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوسکے گا اس لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں زمین کی پیداوار ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز دے۔ آپ نے فرمایا بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز کیوں طلب کرتے ہو؟ اچھا شہر میں جاؤ وہاں تمہیں تمہاری چاہت کی یہ سب چیزیں ملیں گی۔ ان پر ذلت اور مسکینی ڈال دی گئی ہے اور خدا کا غضب لے کر وہ لوٹے، یہ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے

تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے۔"

وہ اپنی تھیوری کے حق میں دلیل دیتی ہیں کہ ولیوں ، صوفیا اور شہیدوں کو خاص رزق ملتا ہے۔ اسی وجہ سے یہودی ذہین لوگ ہیں۔ یوں صوفیا اور شہیدوں کو اس رزق میں شامل کرنا ہی غلط تشریح ہے۔ قرآن شریف کی آیت 57 میں جن طیبات کا ذکر ہے وہ رزق یا اشیاء خورونوش ہیں جو ہم عام طور پر کھاتے ہیں۔ حق تعالی نے کہیں بھی ان کو حلال طریقہ کمائی اور حرام طریقہ کمائی سے منسلک نہیں کیا ہے۔ اب ہم ایک مثال کے طور پر دیکھتے ہیں آپ رزق کو حلال کمائی سے خریدتے ہیں جبکہ آپ کا کوئی عزیز یا دوست یا ایسا ناواقف کار جس کا معاش حرام ہونے کا آپ کو علم نہیں اور آپ اس کی دعوت پر کھانا کھانے چلے جاتے ہیں۔ اب کیا ایک ہی جگہ پکی ہوئی اشیاءِ طعام تو اس کے باورچی خانہ میں پہلے ہی اپنی کیمسٹری تبدیل کیئے ہوئے پڑی ہیں آپ وہ اشیاء طعام کھا جاتے ہیں اب اس تبدیل شدہ ہیت والی اشیاء کے آپ کے خون پر کیا اثرات مرتب ہونگے ؟ خود سوچئے اور جواب ڈھونڈیئے۔۔۔۔ یعنی بانو قدسیہ محترمہ تو آیت 58 میں حق تعالی کا دیا رستہ حِطَّةٌ بھی بند کر گئی ہیں۔ کہ بس ادھر کسی نے حلق سے حرام لقمہ نیچے اترا اور اس کا لہو بدل گیا۔ ان سے پوچھا جائے بعد ازاں احساس جرم ہو جانے پر رب کی رحمت کا پھر کیا ہوگا۔

اب رہ گیا مسئلہ یہودیوں کے عام انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ ذہین ہونے کا تو ان کی سوچ کے پیچھے بھی وہ ناپختہ علم ہی ہوسکتا ہے جو سن 50 کی دہائی کے بعد امریکہ میں یہودی ماہرین حیاتیات کی غلط اور خود غرضی پر مبنی تحقیقات کا نتیجہ ہی مان سکتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے اوراق الٹیے جب اسلام کا سورج پوری آب و تاب سے اس وقت کی معلوم دنیا پر چمک رہا تھا تو مسلمان قرآن کے بموجب غور وفکر، تدبر، ادراک ، فہم اور بصیرت کے ساتھ قرآن کے روحانی اسراروں کی تطبیق سے سائنسی و سماجی علوم کے جد

امجد بنے۔ میں نام نہیں گنواؤں گا بلاوجہ طوالت ہو گی۔ تب یہودی ذہن کہاں تھے؟ عربی زبان سیکھ کر قرطبہ و بغداد اور مصر کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرنا یورپیوں کے لیے وجہ افتخار تھی۔ آپ حال ہی میں تاریخ پر تحقیقی انداز میں لکھی گئی کتاب دیکھ لیجیے۔

Silk Roads (A new History of the word) By Peter Frankopan

قرون وسطیٰ کے مسلمان کی شان جہاں بیان ہوئی ہے وہاں پر ایک بڑا باریک نقطہ بھی انہوں نے بیان کیا ہے کہ مغرب سے مشرق کی طرف جانے والوں کے لیے ایک گائیڈ موجود تھی جس میں عربی زبان جاننا، داڑھی رکھنا اور صفائی ستھرائی کے اسلامی شعار لازمی تھے تا کہ مغربی لوگ مشرق میں جا کر مہذب نظر آئیں۔ جیسا کہ آج ہمیں سماجی بُعد پیدا ہو جانے کی وجہ سے مغرب کی روشنی چکا چوند کر رہی ہے تو وہاں جانے سے پہلے IELTS, G.R.E اور TEFL وغیرہ کے کورس کرنے لازمی ہیں۔

تو محترم قارئین! بات پھر وہیں آتی ہے کہ انسانوں کے جس گروہ کو آسودگی، پر امن معاشی و معاشرتی استحکام نصیب ہو گا، جس معاشرہ میں سائنسی تجربہ گاہیں اور بلند پایہ دانش گاہیں موجود ہوں گی وہیں ذہانت اپنے جوہر دکھاتی اور نکھارتی ہے۔ ورنہ وہ خاص من وسلویٰ کھانے والے شروع سے ہی سائنس، فنِ تاریخ، اور فنِ سماجی علوم کے ماہرین و امام ہوتے۔ اپنے اس موضوع یعنی Genetic Mutation بوجہ رزق حلال یا حرام ضمنی اشارہ ۔۔۔ بقول بانو قدسیہ محترمہ رزق حلال کمانے اور کھانے سے بعض اوقات مجذوب نما super abnormal بچے بھی پیدا ہو سکتے ہیں، کی طرف ہے۔ (دیکھئے راجہ گدھ کے دو اختتامی پیرا گرافس) وہ سپر ابنارمل بچہ ناول کے ہیرو آفتاب کا بیٹا افراہیم ہے۔ جس کی بیماری کو کوئی اور تو سمجھ نہ سکا قیوم جیسا راجہ گدھ آفتاب کو آگاہ کرتا ہے کہ اس کا بچہ سپر ابنارمل ہو چکا تھا۔ اور بانو قدسیہ محترمہ نے خواہش کی ہے کہ کوئی وقت آئے گا جب سب انسان اس ارتقائی عمل سے گزرتے ہوئے سپر ابنارمل بن جائیں گے۔ واللہ عالم الغیب! کبھی ایسا ہو جائے مگر اس پر فی زمانہ مندرجہ ذیل

اعتراضات لگتے ہیں:

۱۔ آفتاب کے لہو میں کوئی رزق حلال کے genes نہیں دوڑ رہے تھے۔ اس کے باپ کو قالینوں کا بڑا کاروباری دکھایا گیا ہے جبکہ تمام لوگ آگاہ ہیں کہ 70ء کی دہائی میں یہ صنعت پاکستان میں اپنے عروج پر تھی اور بہترین اور جلد از جلد زیادہ سے زیادہ پیداوار چھوٹے بچے بچیاں ہی دے سکتے تھے لہٰذا اس دہائی میں ایک قالین مافیا نے عام غریب خاندانوں کے بچوں کا جم کے استحصال کیا۔ کم مزدوری سے لاکھوں روپے کمانے والے قالین بان اور ان کے ڈیلرز کس طرح کا رزق حلال کما رہے تھے جن کا اپنی بے پناہ اڈتی دولت میں سے OBI اور سوشل سکیورٹی کے فنڈز دینا تکلیف سے مر جانے کے برابر تھا۔ پھر محنت کا استحصال بذات خود حرام کمائی پر منتج ہوتا ہے۔ ان معصوم اور راندہ درگاہ بچوں کے لیے تعلیم، صحت، تفریح اور بڑھاپے کی کسی بھی سکیم کی عدم موجودگی میں ان سے بے پناہ پیدا ہونے والی دولت کو آپ کس حد تک حلال اور کس حد تک حرام قرار دیں گے۔ لہٰذا جونہی مغربی ممالک کو اس استحصال کا ادراک ہوا تو پاکستانی قالینوں کی مغرب میں فروخت پر مکمل پابندی لگ گئی اور وہ صنعت اپنی موت آپ ہی مرگئی۔

۲۔ قیوم کا کردار بقول بانو قدسیہ محترمہ ایک مردار خور جیسا تھا۔ اس میں گیان اور الہام کی کون سی طاقت پیدا ہوگئی تھی کہ ایک مکروہ زندگی گزارنے کے بعد وہ بچے افراہیم کے متعلق درست پیش گوئی کرتا ہے اور اس کے اس مرض کی تشریح کرتا ہے جس کی نہ والدین کو سمجھ تھی نہ ہی مشرق و مغرب کا کوئی نفسیاتی معالج اس بیماری کو سمجھ سکا تھا۔

۳۔ اب اگر سپر نارمل بن کے تمام انسان ٹیلی پیتھی اور دور بینی نگاہ کے مالک ہو جائیں گے تو بھی معاشرہ ایک سطح کو چھو کر جاہل ہی رہے گا کیونکہ ارتقائی اصولوں کے مطابق جمود بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ اس دور کے اپنے مسائل ہونگے لہٰذا سپر ابنارمیلٹی بھی اپنی اہمیت کھودے گی۔ تب انسان کو اس سے بھی زیادہ سپر ڈپر ابنارمیلٹی کی منزل تلاشنا

ہو گی۔ اس لئے یہ نارمل اور سپر ابنارمل کا قضیہ بقول بانو قدسیہ محترمہ کی تھیوری لا ینحل ہی ہے اور رہے گا۔

۴۔ Genetic evolution کی فرائڈین تھیوری ڈاروِن ازم سے متاثر تھی جو حضرت آدمؑ کے imperfact پیدا ہونے پر دلالت کرتی تھی لہٰذا متاخرین نے اسے تمام سائنسی ونظریاتی سوچ بچار کے بعد بری طرح رد کر دیا۔ (بحوالہ General of Creation 2010 (2) 24 صفحہ 120)

یاد رکھیئے! سگمنڈ فرائڈ یہودی تھا اور منہ کے کینسر کی وجہ سے خودکشی کر کے اس دارِ فانی سے رخصت ہوا۔

اس بحث کو یہیں سمیٹتے ہوئے میں اپنے ملک کے ایک عظیم سماجی و روحانی دانشور جناب ڈاکٹر افتخار حسین بخاری کی کتاب ''آ گہی سے آگے'' میں ایک مضمون ''حصول یا تقسیم'' صفحہ 148 سے حوالہ دے کر بات ختم کروں گا:

> ''اس سے قبل ایک مضمون میں تفصیل سے لکھا تھا کہ انسانوں میں انسانیت، معرفت اور روحانیت کے ساتھ نظریات تک میں رشتے جلی یا نسلی یعنی Biological نہیں ہوتے بلکہ خالص نظریاتی یعنی ideological ہوتے ہیں۔ ورنہ علم آگے بڑھ کر کبھی بھی دانش نہ بنتا۔''

آخری بات بانو قدسیہ محترمہ نے راجہ گدھ کے بعد باقاعدہ ناول ''حاصل گھاٹ'' لگ بھگ 2000ء کے بعد لکھا جس میں وہ اپنی تھیوری حرام وحلال سے یکسر کنی کاٹ گئی ہیں۔ پورے ناول میں مشرق ومغرب کا روحانی و مادی تجزیہ اتنا زیادہ پیش کیا ہے کہ ناول کی اصل سٹوری محض چند صفحات کی رہ جاتی ہے۔ روحانیت پر خوب زورِ قلم دکھایا مگر اپنی سابقہ تھیوری کو خود ہی بھلا کر راجہ گدھ کے وجود کا جواز ہی ختم کر دیا۔

○

باب 7

راجہ گدھ میں جنسی اشارے

کوئی بھی ادیب انسانی معاشرے پر انسانوں کے متعلق ہی لکھتا ہے۔ اس کا مرد و عورت کے تعلقات بیان کرتے ہوئے جنسی اتصال کے مناظر لکھنا مجبوری ہوتی ہے۔ پھر سوسائٹی ٹو سوسائٹی اخلاقیات کی حدود متعین ہیں۔ امریکی، یورپین یا کوئی فار ایسٹرن ملک کا ادیب شاید مقابلتاً اسلامی ممالک کے ادیبوں کے زیادہ آزاد ہوسکتا ہے اور اپنے اپنے افراد معاشرہ کو وہی تصویر دکھاتا ہے جس سے وہ پہلے ہی خوب آگاہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ادب چاشنی پیدا کرتا ہے۔ لیکن اسلامی معاشروں میں جنسی رائے دینا taboo میں شمار ہوتا ہے مثال کے طور پر آج کل یعنی 2016ء میں ARY پر ایک ڈرامہ ''اڈاری'' دکھایا جارہا ہے جس کا موضوع child sex abuse ہے۔ یہ ایک حقیقی سماجی مسئلہ ہے۔ اس موضوع کے exposure پر ہی عوام کی طرف سے کراہت کا ردّعمل سامنے آیا ہے۔ کیونکہ بہر حال سماج میں باشعور اور سمجھدار لوگ اپنے بچوں پر watchful رہتے ہیں۔ اگر بانو قدسیہ محترمہ نے ناول ایک خاص تھیوری کی وضاحت اور لامحالہ معاشرہ میں ایک مثبت اثر یعنی نیکی کی ترویج کے لیے لکھا تو پھر جگہ جگہ واضح جنسی زبان استعمال کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ کچھ باتیں بطور تھیوری پیش کی ہیں جن کا پڑھے لکھے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو پہلے علم نہ ہو مگر اس ناول کو پڑھ کے وہ سالوں کی زقند بھر جاتے ہیں اور چونکہ یونیورسٹی طلبہ طالبات کا مقصد رزق کمانا تو نہیں ہوتا وہ ذہنی

عیاشی میں پڑ کر اپنی تعلیم کو بھی خراب کر سکتے ہیں اور آئندہ رزق کمانے کے prospect سے بھی محروم رہ سکتے ہیں۔ ٹین ایج اور اوائل جوانی میں جنس سب سے پراسرار شے کے طور پر پہلے ہی ذہن پر چھائی ہوتی ہے اوپر سے کھول کھول کے بیان کر دینا مزید لذت آگیں بن جاتا ہے۔ پہلے صفحہ پر ہی فرماتی ہیں۔ قیوم کے والد نے اسے بچپن میں سختی سے منع کیا ہوتا ہے کہ وہ چچا غلام رسول کی مجلس ہرگز اختیار نہ کرے گا۔ لیکن یونیورسٹی پہنچتے ہی پروفیسر سہیل عشق لاحاصل پر وہ کمال کی بحث کرواتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مرد کی جنسی قوت کے اظہار کو انسان کی قوت محرکہ ہونے پر بحث کرواتا ہے تو قیوم، آفتاب اور سیمی شاہ کو پہلے دن سے ہی عشق لاحاصل کا خواب عطا کر دیتا ہے۔ وہ لاحاصل کو تو بعد میں سمجھتے ہیں لیکن خشوع وخضوع سے عشق شروع کر دیتے ہیں۔ ماہرین نفسیات و غذائی علوم کی رائے میں 3 وقت یا 2 وقت کھانا کھانے کی عادت انسانوں میں تھوڑی پختہ عمر میں شروع ہوتی ہے لیکن بچپن اور جوانی میں مائیں پریشان ہوتی بھی رہیں کہ میرا بیٹا یا بیٹی 3 وقت کھانا نہیں کھاتا تو ڈاکٹر کا سوال ہوتا ہے کہ کتنی پاکٹ منی روز دیتے ہیں؟ جواب میں جو رقم ماں بتاتی ہے تو ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں آپکا بیٹا یا بیٹی اسی سے تو سارا دن چگتا چرتا رہتا ہے۔ جسمانی نشوونما کی ضرورت کے تحت لڑکے لڑکیاں وقفے وقفے سے کھاتے پیتے رہتے ہیں اب اس عادت کو بانو محترمہ نے پتہ نہیں کس جگہ سے علم حاصل کر کے خصوصاً لڑکیوں میں بار بار کھانے کو جنسی بھوک کے اظہار کے ساتھ منسلک کر دیا۔ ایک ایسی فیملی کا پتہ چلا جس میں کزنز (cousins) کی کافی تعداد تھی۔ ان کا آپس میں قریبی رابطہ بھی رہتا تھا۔ ایک نے راجہ گدھ پڑھا تو سبھی تک خبر پہنچی۔ سبھی نے اس ناول کو پڑھ لیا عشق لاحاصل کے غم میں بھی مبتلا ہوئے۔ صفحہ 41 اور 42 ایڈیشن 1998ء کے مطابق اور ناول میں پیش کی گئی تھیوری کہ لڑکیاں بار بار کیوں کھاتی ہیں کے تحت اچھا خاصا خاندانی ماحول خراب ہوا۔ صفحہ 44 پر یہ جنسی اشارہ ملاحظہ کیجئے:

''بھوک کی نمائش کے بعد سیمی کی ہنسی میں بڑی جنسی کشش تھی۔ وہ عموماً گردن پیچھے کر کے غرغرے کرنے کے انداز میں منہ کھول کر پاٹ دار آواز میں ہنستی۔ ایسے میں اس کے کندھے بازو پیٹ چھاتیاں سب ہلکورے لینے لگتے۔ اس کا قہقہہ عام طور پر مصنوعی ہوتا۔ لیکن بناوٹی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ لپ سٹک، بریزئر، اور سینٹوں کے اشتہاروں کی طرح کوئی چیز آپ کو یقین دلاتی تھی کہ قہقہہ محض اشتہار ہے اصل سیمی اس اشتہار سے بھی اچھی ہوگی۔''

پھر صفحہ 102 پر دیکھئے۔ جسمانی اتصال میں پہلے بوسے پر کیا جذبات ہو سکتے ہیں:

''پہلا بوسہ، پہلا تحفہ۔۔۔۔ پہلی مرتبہ اقرارِ محبت میں گرمیوں کی اوّلین بارش جیسی کیفیت ہوتی ہے سارے میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیل جاتی ہے۔''

صفحہ 190 پر جو جنسی اشارہ دیا گیا ہے اگر کمرہ جماعت میں طلبہ و طالبات استاد صاحب سے اس کی وضاحت طلب کرلیں تو استاد صاحب کی کیا حالت ہو سکتی ہے:

''ابھی چندرا گاؤں میں برسیم کے کھیت اتنے گھنے تھے کہ عزیز گاتن گنا چوستا ان میں جاتا، دھوتی کھولتا اور دوبارہ باندھ لیتا، کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے؟''

اب صفحہ 194 پر چچا غلام رسول عزیز گاتن کو جو اسکی ماں کے بارے میں واشگاف الفاظ میں ہدایات دیتا ہے۔ وہ بھی taboo کے دائرہ میں آتی ہیں اور غیر ضروری جنسی اشارہ ہے۔

''حرامی! اپنی فیشن کی ماری ہوئی ماں کو کہنا پہلے جسم کی صفائی سیکھے۔۔۔۔ بتانا اسے جسم کے بال ناپاک ہوتے ہیں۔ اسے میرا یقین نہ آئے تو جا کر ملاں جی سے پوچھ لے مسجد میں۔۔۔۔۔ ویسے تو اسے بڑے مسئلے آتے ہیں۔ جسم کے بالوں کا مسئلہ نہیں آتا کوڈو کو۔۔۔۔۔۔؟''

مزید صفحہ 420 پر ایک خاص جنسی اشارہ خود پڑھ لیں۔ شریف مرد اور عورتوں کو شاید آج بھی اس کا علم نہ ہو مگر بانو قدسیہ محترمہ نوجوانوں کو رزق حلال کمانے کے لیے کس قسم کی تربیت سے گزار رہی ہیں:

''امتل کے ساتھ رہنے میں خاص آرام یہ تھا وہ کچھ نہ مانگتی تھی، نہ جسمانی تعلق نہ روحانی محبت نہ روپیہ پیسہ نہ شہرت نہ تعریف۔۔۔۔ جس طرح 95% مرد اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے وقت ذہن میں کال اپنی محبوبہ سے ملا کر رکھتے ہیں۔''

پھر صفحہ 479 اور 480 پر آسمان پر اٹھنے والے بادلوں کو تو ہم نے آج تک ایسی شکل میں نہیں دیکھا مگر بانو قدسیہ محترمہ کو کیسے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

''سارے آسمان پر بھاری پستانوں کی شکل کے گول گول بادل چھائے تھے۔ آسمان مائیکل اینجلو کی بنائی ہوئی تصویر نظر آتا تھا۔''

''مجھے سرِ دست خوبصورت لڑکی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے نگاہیں آسمان پر جمالیں وہاں بڑے بڑے مدوّر پستانوں جیسے بادل ساکت کھڑے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان میں سے ابھی دودھ برسنے لگے گا۔''

بانو قدسیہ محترمہ نے جہاں جا بہ جا مغربی اور ماڈرن تعلیم کی توہین و تنقیص کی ہے

وہیں پر وہ ہماری نسلوں کو اسی طرح کے جنسی اشارے سمجھا کر کونسی مشرقی تعلیم سے آشنا کرنا چاہتی ہیں تاکہ وہ ان کی دی ہی کُھلی ڈُھلی تعلیم کے زیر اثر خوب رزق حلال کمائیں۔۔۔۔یا پھر رزق حرام؟ شاید بانو قدسیہ محترمہ کے اسی علم شناسی سے متاثر ہو کر ممتاز مفتی نے ایک مشترکہ کتاب لکھنے کا مشورہ دیا تھا جس میں عورت کے ڈائیلاگ بانو قدسیہ محترمہ اور مرد کے ڈائیلاگ ممتاز مفتی کی طرف سے لکھنا تجویز ہوا۔ (دیکھئے ''راہ رواں'') پھر بانو قدسیہ محترمہ صفحہ 236 پر نوجوان نسل کو کیا تعلیم دے رہی ہیں جب سیمی شاہ کی ہسپتال میں موت واقع ہو جاتی ہے تو قیوم کہتا ہے کہ:

''اُس کے بعد میں نے قیوم کو الوداع کہا اور آفتاب کا چولا پہن کر میں سیمی کے ساتھ لپٹ گیا۔''

لو جی! قیوم صاحب ساری رات مردہ سیمی کے ساتھ سویا رہا۔ اس کتاب کے چھپنے کے کچھ عرصہ بعد پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک نوجوان مردہ لڑکی کو قبر سے نکال کر ایک اوباش نے لاش کے ساتھ زیادتی کیا تھا۔ غالباً 1983ء یا 1984ء وزیر آباد۔ پھر کراچی میں یہی بھیانک فعل مکرّر رہوا۔ یعنی بانو قدسیہ محترمہ کے اس جنسی اشارے نے نوجوان ذہنوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ ایسے گھناؤنے ترین جرم کے مرتکب ہوئے۔ بظاہر یہ لگتا ہے چونکہ قیوم کو راجہ گدھ ثابت کرنا تھا تو اس سے ایسی حرکات سرزد ہونا ناول کی کہانی کا حصہ ہے مگر دلچسپ بات ہے اس کی رگوں میں ایک محنتی کسان کا رزق حلال دوڑ رہا تھا۔

اس ناول کے پڑھنے سے فوراً کیا حزن و ملال اور مایوسی پیدا ہوتی ہے اس کی مثال آپ کو ''راہ رواں'' میں اپنی طرف سے اعلیٰ مضمون سمجھ کر چھاپا ہوا عنوان ہے ''اُن دنوں۔۔۔۔راجہ گدھ۔۔۔۔۔ایک تاثر'' از مسعود میاں

''پھر جب میں نے اس سے کہا ''یار! جب سے میں نے یہ ناول

پڑھا ہے تب سے ایک بے نام اداسی ہر طرف چھائی رہتی ہے سیمی
کو ملنے سے پہلے تک جتنے لوگ بھی مجھے ملے وہ سب عورت کی
بے وفائی سے ڈسے ہوئے تھے شاید میں اسی ایک عورت کو بے وفا
مخلوق سمجھنے لگ گیا تھا۔ لیکن یار! یہ سیمی تو بالکل مختلف قسم کی لڑکی
ہے میں نے اس سے پہلے کسی لڑکی کو مرد کی محبت میں اس طرح
دیوانہ ہوتے دیکھا نہ سنا۔ کیا مجھ پر چھایا حزن و ملال اس وجہ سے
تو نہیں ہے؟ کیا یہ کسی آئیڈیل کو تلاش نہ کر سکنے کا لاحاصل
احساس تو نہیں ہے۔''

گو یہ مسعود میاں صاحب آگے جا کر رزق حلال و حرام کمانے پر بحث کرتے ہیں۔ لیکن اپنے پہلے تاثر حزن و ملال سے باہر آئیں تو نہ۔

○

باب 8

بابے

تصوّف پر مختصر سی بحث میں پہلے ہی لکھ آیا ہوں۔ پھر پروفیسر سہیل کے کردار کے تجزیہ کے دوران میں نے ذکر کیا ہے کہ یہ کردار خالصتاً اشفاق احمد خان مرحوم کے دور لیکچرار شپ کی تصویر کشی ہے۔ بعدازاں ہم دیکھتے ہیں کہ اشفاق احمد خان مرحوم کسی سیاسی وابستگی اور دائیں بائیں کی تنظیموں سے گریزاں رہے اور صرف اور صرف اپنی ذات اور خاندان کی سرفرازی کے لیے سرگرداں رہے۔ اس بابت ہمیں بہت سارا مواد خود بانو قدسیہ نے ''راہ رواں'' میں مہیا کر دیا ہے۔ اس ناول میں پروفیسر سہیل بھی لیکچرار اشفاق احمد خان کی طرح بابوں سے متاثر ہے۔ مغربی و مشرقی تعلیم کے بلند معیارات کو چھو کر بھی اندر کی روحانی بے چینی کی تسکین کے لیے دونوں ہی بابوں کے پاس بھاگتے رہے۔ ''راہ رواں'' صفحہ 267 سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> ''خان صاحب ایک انتہائی ذہین، پڑھے لکھے، جدید نظریات پر یقین رکھنے والے اور مغربی طرزِ زندگی سے متاثر انسان تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی علوم، تہذیب اور ثقافت سے بھی بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی لگاؤ انہیں بابوں کی تلاش پر اکساتا رہا۔ نور والوں کے ڈیرے میں جب ان کی ملاقات ایک بابا جی سے ہوئی تو ان کے خیالات میں عظیم تبدیلی آ گئی اور بقول اشفاق

احمد صاحب ''نور والے بابا جی سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ اصل گیان، علم اور انسان کو سیدھا راستہ دکھانے کا نسخہ تو ان بابوں کے پاس ہے۔''

''یہ بابے مادی ترقی کے مخالف نہیں لیکن انسانی شخصیت کو سنوارنے اور روحانی ترقی کا جو درس ان کی باتوں میں ملتا ہے وہ کہیں اور سے نہیں ملتا۔ بابا جی کی باتوں اقوال کی جھلک اشفاق احمد صاحب کی تحریروں میں بھی نظر آنے لگی اور شاید ان ہی ملاقاتوں اور باتوں نے انہیں ''من چلے کا سودا'' جیسی سیریل لکھنے پر راغب کیا۔''

اب اسی اقتباس کی روشنی میں ہمارا تجزیہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ اشفاق صاحب خود مغربی تہذیب اور جدید علوم کے مقلد تھے۔ خود غرض تو وہ تھے ہی لیکن ساتھ ساتھ ہی ایک من گھڑت بابا ازم میں یقین کرنے لگ گئے۔ عقل سلیم کو پرے رکھا اور متکلمین اور راندۂ دنیا انسان جو ہر صورت مروجہ شریعت اور معاشرتی دھارے کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتے ہیں بلکہ نام نہاد سینہ بہ سینہ چلتی متصوفانہ روایات کے امین ہوتے ہیں۔ ان کے علم الکلام کے سحر میں آ گئے۔ جب میں نے اس ناول پر تنقید لکھنے کا سوچا تو اپنے علاقے کے مشہور بابوں کے پاس جانا شروع کیا۔ میں حیران رہ گیا ان سب کے نظریاتِ تصوف اپنی اپنی ذاتی اختراع اور لن ترانیوں پر مبنی ہیں۔ ہر کسی نے شریعت اسلامی کا کوئی ایک عمل پکا کیا ہوا ہے۔ مکمل اسلامی Traits کسی ایک میں بھی موجود نہیں۔ البتہ بڑے بھاری بھاری جملے مقولے اور علم الکلام کے تحت ذاتی قرآنی تشریحات ان کا وطیرہ ہیں۔ ان سے متاثرین کی کثیر تعداد کمزور دل و دماغ، کم علم اور وہمی لوگوں پر مشتمل ہے۔ دیکھا بھی یہی گیا ہے کہ اپنی ذات میں ڈِھل مِل اور کامل

قوت ارادی کی کمی والا یا پھر دنیا کے تلخ حقائق سے منہ موڑنے والا انسان بہت جلد ان بابوں کے طلسم کا شکار ہو جاتا ہے۔ آپ جب عقل کی سان پر ان بابوں کے احکامات کو پرکھتے ہیں یا تو وہ ناراض ہو کر آپ کو اناپ شناپ دینے لگ جاتے ہیں یا پھر آپ کے نقطہ نگاہ کو تسلیم کر کے آئندہ آپ سے نظریں چرانا شروع کر دیتے ہیں۔ میں اپنے پورے یقین اور تحقیقی ایمان کے ساتھ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ راجہ گدھ میں بھی بابوں کا کردار بانو قدسیہ محترمہ نے اشفاق مرحوم کی شہہ پر ڈالا۔ ایک تو ناول کی طوالت بڑھ گئی اور دوسرا پراسراریت کا element بھی پیدا ہو گیا۔ بانو قدسیہ محترمہ خود ایک مزدور لکھاری کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ تا عمر انہیں کوالٹی سے زیادہ کوانٹٹی کا خیال رہا کیونکہ انہیں مزدوری کما کر گھر چلانا ہوتا تھا۔ راہ رواں میں لکھتی ہیں کہ شروع میں میں سرحد ٹیکسٹ بورڈ کی ٹیکسٹ بکس لکھ لکھ کر کوئی 70 ,60 روپے ماہانہ کمایا کرتی تھی۔ پھر ''راہ رواں'' کے صفحہ 350 پر باب بعنوان 121 ۔سی ماڈل ٹاؤن ۔''ذاتی مسلک'' میں رقم طراز ہیں:

''یقین جانیے کہ جو کچھ بیرون میں ہوتا ہے، اس پر میں نے بہت کم نگاہ ڈالی ہے۔ یوں سمجھیے میری زندگی اٹکل گریز، سنی سنائی، بنی بنائی، محسوس کی گئی، اندازہ لگائی گئی تحقیق سے بہت دور ہوتی ہے۔ ڈیٹا کو بنیاد بنا کر، سامپل جمع کر کے تاریخ وار حسابی شکل کے گوشوارے تیار کر کے لکھی گئی تصدیق شدہ کتابیں سائنسی طریق کار کے قریب ہوتی ہیں۔''

''عین ممکن ہے میں نے کچھ واقعات غلط، کچھ حادثات بے ربط، کچھ بیانات افراط و تفریط کے ساتھ قلم بند کئے ہوں۔ میں ابتداً معافی کی خواستگار ہوں کہ میں اشفاق احمد کو آپ کے ساتھ ساتھ

سمجھنے کی کوشش میں برسر پیکار ہوں۔ اشفاق احمد کون تھے؟ میں
وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ ان کا مسلک کیا تھا؟"

لیجیے!!! آپ کرلیں تحقیق !!! خاتون 16 دسمبر 1956ء سے لیکر 2004ء تک ایک مرد کی منکوحہ بیوی کے طور پر جو ان کے سفر وحضر میں ساتھ، جو اس کے غموں، خوشیوں میں ساتھ، بچوں کی پیدائش پھر ان کی پرورش میں ہر طرح سے ملوث رہیں، جو نکاح والے دن سے بینک اکاؤنٹ کی چیک بک جس میں 90 روپے جمع تھے مالک رہی، وہ ان کے بارے میں تشکیک کا شکار ہیں۔ وہ پورے وثوق سے رزق حرام سے انسانی Genes کے Mutate ہونے کی تھیوری اور پھر بابوں کے ذریعے تمام معاشرہ کا اخلاق اور مسائل کے حل ہو جانے کی تھیوری کس طرح پیش کرسکتی ہیں یا پھر ایک مفروضہ اور قائم ہوتا ہے! یہ سب کچھ اشفاق احمد خان کے بارے میں بھی جانتی تھیں۔ ان کا مسلک بھی ان پر واضح تھا مگر یہاں تجاہل عارفانہ سے کام لے گئیں۔ اور انہیں اشفاق کا مسلک بھی معلوم نہ ہو سکا۔

محترم قارئین! راجہ گدھ اس سیاسی حکومتی ماحول کی ضرورت کے تحت لکھا گیا لیکن بابوں کا ذکر مجبوراً کیا اور بابا جی ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ بابے دعا دینے کے پابند ہوتے ہیں۔۔۔اور وہ کر دیتے ہیں۔ بالآخر یہ حضرت انسان خود ہی ہے جسے اپنی راہ علم اور عمل کی بنیاد پر متعین کرنی ہوتی ہے۔ اپنی زندگی میں انسان اپنی خوشیاں تو دوسروں سے شیئر کرسکتا ہے مگر اپنے غموں اور دکھوں کی گٹھڑی اسے خود ہی اٹھا کر چلنا پڑتا ہے۔ اپنے ہاتھوں لگے دامن پر داغوں کو اپنے ہی آنسوؤں سے خود ہی دھونا پڑتا ہے۔ اگر نیکی کے پودے لگاتا ہے تو اطمینان قلب اور روحانی مسرت کا حصول بھی اسی کا مقدر ٹھہرتا ہے۔

بقول سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ:

نہ کر منتاں خواج خضر دیاں
تیرے آپے اندر ای آب حیاتی ہُو

ہاں! شاید ہوشیار اور زمانے کی نبض کو شناخت کر لینے والے اشفاق احمد مرحوم نے بابوں کا ذکر اس لیے کروایا کہ جو قوم ہندوانہ عقائد کے مقابلے اسلامی تعلیمات کو اختیار کرنے سے ہچکچاتی ہے، وہ تعلیم جو بار بار عقل، تدبر، فہم اور بصیرت کے استعمال پر زور دیتی ہے وہ قوم آج تک اس تعلیم سے گریزاں ہے۔ جو قوم تھانے کچہری جانے سے D.C اور S.P کے دفتر میں اپنے حقوق کی خاطر جانے سے ڈرتی ہے۔ لیکن اگر تھانیدار، پٹواری یا کلرک کی نوکری مل رہی ہو تو فوراً بھرتی ہونے کو ترستی ہے۔ وہ قوم جو مغرب کی چکا چوند سائنسی ترقی کے مقابلہ میں اپنی کم ہمتی دیکھ کر انہیں زبانی کلامی معتوب کرتی ہو مگر۔۔۔۔ اگر وہاں کا مفت ویزہ مل رہا ہو تو منہ سے رالیں ٹپکانے لگ جاتی ہو۔ وہ قوم جس کے افراد آج بھی فخر سے بتانا پسند کریں کہ جی ایسی جاب ملی ہے جس میں محنت کم اور آرام ہی آرام ہے۔ جو قوم ابھی بھی قرآن کی سائنسی روح کو نہ سمجھ کر اسلاف کے کارناموں پر فخر کرتی ہو اور معیار تعلیم کو بلند نہ کر سکتی ہو اور جو قوم جو تمام نظام تعلیم کو کم از کم اردو میں حاصل کرنے اور اس کے مادی فوائد سے نابلد ہو اور جو قوم جس کی انا اجتماعی حقوق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد پر ٹس سے مَس نہ ہو جائے لیکن ذاتی انا کے تحت معمولی باتوں پر اپنے ہی بھائی بندوں کو قتل کرتی ہو اور جو قوم جو آج تک سڑکوں پر چلنے کے آداب نہ سیکھ سکی ہو، ٹریفک کے اشاروں کی افادیت کو سمجھنے کی بجائے انہیں ایک راستے کی اٹکل سمجھتی ہو اور جو قوم قطار میں لگنے کو توہین سمجھتی ہو۔ شاید ایسی قوم کے لئے ڈِھل مِل بابا ازم ہی بہتر ہے!!!

○

باب 9

راجہ گدھ میں بانو قدسیہ کا فلسفہ محبت

ہم بانو قدسیہ محترمہ کے فلسفہ عشق و محبت پر بحث اور عشق و محبت کی تفریق بھی پچھلے ابواب میں کر آئے ہیں۔ لیکن اس باب میں میری کوشش ہے کہ ان کے ناول راجہ گدھ سے اقتباسات پیش کر کے بین السطور چھپی ہوئی نیت سے شناسا کرواسکوں۔ آپ یہ تو بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ بانو قدسیہ محترمہ اور اشفاق احمد خان مرحوم کسی سیاسی وابستگی کے بغیر اپنی زندگی کی گاڑی کو مادی کامیابی کے پہاڑ پر قدم بہ قدم اوپر ہی اوپر لے جانے میں جتے رہے۔ انہوں نے شاید۔۔۔ پھر کہوں گا۔۔۔ شاید فلاح اور بھلائی کی آس پر تمام آنے والے حکمرانوں کا ساتھ دیا۔ کسی کو برا نہ سمجھا۔ مگر تحقیقات کے نتیجہ میں تین اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی پسند اور ناپسند کا علم ہوتا ہے۔ ایک تو 60ء کی دہائی میں لکھے گئے ناولٹ ''پروا'' سے جس میں انہوں نے ایک غیر آئینی صدر کا نام لکھ کر اسے ایک ادبی سہارا مہیا کیا۔ دوسرا بانو قدسیہ محترمہ نے بھٹو صاحب سے اپنی کراہت کا اظہار کیا ہے۔۔۔ بھٹو صاحب کے انجام کی بابت ایک خواب دیکھ کر۔ پھر ان کا بھٹو دور کا لٹریچر بھی شدہ شدہ اس سیاسی دور سے کراہت کا اظہار کرتا ہے۔ دیکھ لیجیے ان کا افسانہ ''کرکل''۔ تیسرا واضح پسندیدگی کا اشارہ جنرل ضیاء کے دورِ حکومت کے لیے یہ ناول لکھنا ہے۔ چونکہ اسلامائزیشن کا غلغلہ عروج پر تھا۔ حدود آرڈیننس کا اخلاقی جواز بھی چاہیے تھا۔ آئینی ترمیم کے ذریعہ پارلیمان کے تمام اختیارات صدر کی ذات وحدت

میں مرتکز کر دیئے گئے تھے۔ اور ان کم عقل جمہوریت دشمن لوگوں کو ان کی ذات میں امیر المومنین کی شبیہ نظر آنے لگ گئی تھی اور اس خواہش کا اظہار بانو قدسیہ محترمہ نے پرندوں کی زبانی کیا ہے۔ اب ایسے سیاسی ماحول میں جہاں پاکستان اسلام کی لیبارٹری بننے جا رہا تھا (دیکھئے End of Past ندیم پراچہ) محبت پر بالعموم اور عورت پر بالخصوص کڑی پابندیوں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا بانو قدسیہ محترمہ کے راجہ گدھ میں مغربی تعلیم اور مغربی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی لطیف پیرائے میں تنقیص و توہین نظر آتی ہے۔ میں مندرجہ ذیل میں راجہ گدھ سے بانو قدسیہ محترمہ کا فلسفہ محبت کیا ہے پر اقتباسات پیش کرتا ہو مگر اس دورِ حکومت اور ان کی ذاتی خواہشات کو مدِ نظر رکھ کر پڑھئے اور سمجھئے:۔

''انسان لاحاصل کے پیچھے بھاگ کر کتنی لذت حاصل کرتا ہے۔''

''کالج کے کئی حلال زادے بازو اُٹھائے بے پرواہ بھاگتی ان ہرنیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں حرامزادے ہو گئے تھے۔''

انسانی فطرت ہے کہ جہاں بھی حسن ہوتا ہے انسان تعریف کرتا ہے مگر خواتین کے معاملہ میں مردوں کی تعریف ہمیشہ دل میں ہی رہ جاتی ہے۔ اور پھر پورے ناول میں عورتوں کی طرف سے مردوں کو دیکھ کر کیا جذبات ابھرتے ہیں، ان کا ذکر ہر جگہ گول کر گئی ہیں اور مردوں کو ناول کے شروع سے ہی معتوب کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

''دراصل بات ڈگری کی ہوتی ہے۔ برقعے والیاں، بے نقاب لمبی چوٹی والی کو آزاد خیال سمجھتی ہیں۔ لمبی چوٹی والی کٹے بالوں والی کو بے حیا سمجھتی ہیں۔ بال کٹی کا خیال ہوتا ہے کہ اس کے تو صرف بال ہی کٹے ہیں۔ اصل حرافہ تو وہ ہے جو دن کے وقت مسکارا بھی لگاتی ہے اور آئی شیڈ بھی۔ آئی شیڈ والی کو یقین ہوتا ہے کہ وہ بے چاری تو اللہ میاں کی گائے ہے۔ اصل میں تو وہ

اچھال چھکا ہے جو ڈوپٹہ نہیں اوڑھتی see through کپڑے پہنتی ہے اور سب کے سامنے سگریٹ پینے سے نہیں چوکتی۔ سگریٹ نوش بی بی کے سامنے تو وہ فسادن ہوتی ہے جو نا محرموں کے ساتھ بیٹھ کر بلیو فلم دیکھتی ہے۔۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ"

یہاں مزے کی بات یہ ہے کہ بانو قدسیہ محترمہ نے کسی ایک کو بھی نہیں بخشا۔ لطیف انداز میں چوٹ کرتی ہیں ہر فیشن پر۔ آپ محترمہ بھول گئیں کہ انسانی معاشرہ رنگا رنگی کا مجموعہ ہے اور یہ رنگا رنگی انسانوں کی آزاد مرضی کے تحت وجود میں نظر آتی ہے۔ عربوں کے یک رنگ معاشرہ میں فرغلوں کے نیچے کیسا کیسا فیشن نکلتا ہے یہ شاید بھول گئیں۔۔۔ یا پھر وہی تجاہل عارفانہ۔ باقی اعتماد سے چلی جاتی عورت کے خیالات کا ایک جہاں ہو سکتا ہے۔ اگر راہ چلتے کسی انسان کے ذہن میں دوسرے کو دیکھ کر جو بھی خیالات آتے ہیں وہ خالصتاً اس کی ذاتی تربیت کے تحت ذاتی ہی ہو سکتے ہیں۔ فساد تب پیدا ہوتا ہے جب آپ غیر مہذب یا اخلاق سے گرے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لیکن یہاں عورتوں کے خیالات کا مندرجہ بالا اظہار حدود آرڈیننس کی شکل میں یک رنگی پیدا کرنا تھا۔ اب ذرا مرد حضرات کے عورتوں پر خیالات بھی ملاحظہ فرمالیں اور دیکھیں کون کون کوڑوں کے قابل ہے کس کس کا لہو رزق حلال سے کشید ہے۔

"اسی طرح مردوں میں بھی نیکی کی تعلّی موجود ہوتی ہے اور اس کی کئی ڈگریاں مقرر ہوتی ہین۔ جو شخص صرف نظر باز ہے اور اچٹتی نظر سے لڑکیوں کو آنکتا ہے وہ ان مردوں کو بدمعاش سمجھتا ہے جو لڑکیوں کی محفل میں راجہ اِندر بن کر بیٹھتے ہیں۔ لطیفوں اور کہانیوں سے فضا کو غزل الغزلات کی طرح رومانٹک کر دیتے ہیں۔ عورتوں سے باتیں کرنے کے رسیا ان مردوں کو غنڈہ سمجھتے ہیں جو

اندھیرے سویرے کواڑ کے پیچھے سیڑھیوں کے سائے میں غسل خانے کی سنک کے پاس چوری چھپے کسی لڑکی کو بازوؤں میں لے لیتے ہیں۔ چوری چھپے بلّے اڑانے والے ان حضرات کو عادی مجرم سمجھتے ہیں جو کھلے بندوں عورتوں کو کاروں میں بٹھاتے اور ہوٹل کے کمرے بک کراتے ہیں۔ عاشقان پر آوازے کستے ہیں جو زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور زنا کاران پر نکتہ چینی کر کے بے قیاس راحت محسوس کرتے ہیں جو زنا بالجبر کرتے ہیں۔ اور قانون کی گرفت میں ملزم ٹھہرائے جاتے ہیں۔

یہ ساری باتیں اپنے آپ کو بری الزمہ کرنے کے لیے کی جاتی ہیں اور ان میں تمام لوگ سوسائٹی سے اپنے لئے approval کا ایک جائز طریقہ تلاش کرتے ہیں۔ ورنہ بات ساری ڈگری کی ہے۔۔۔ کسی معاشرے میں شرافت کا درجہ نارمل متعین کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔"

یہاں بانو قدسیہ محترمہ انسانی جذبات کے بخار پر کُوھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور پھر بالکل ایک فرشتہ نما ذہنی اُپج پیدا کرنے کا کوئی حل بھی نہیں بتاتی ہیں الٹا نوجوان نسل جس میں سے کثیر تعداد کو شاید تا عمر ایسی ذہنی سوچ اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں آتا ان کی بھی تربیت کا سامان پیدا کر رہی ہیں۔ اور پھر کوئی بھی رُول ماڈل مرد جو بالکل کیچوے جیسا شریف النفس ہو جائے پیش نہیں کرتیں۔ لڑکیوں کے بار بار کھانے کو جنسی اشتہا کے روپ میں پیش کر کے ذلت آمیز توہین کرتی ہیں۔ اور خود "راہ رواں" میں لکھتی ہیں کہ اشفاق احمد مرحوم کو جتنے بھی خط لکھے وہ میں نے جلا دیئے۔ کیوں ؟؟؟ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟ ؟؟ تعمیر و ترقی پر اکسانے والا لٹریچر، اگر قوم کو طوق غلامی پہنا دیا جائے تو

مزاحمتی لٹریچر پھر اعلیٰ تعلیمی شعور پیدا کرنے والا لٹریچر قوم کو وہ ذہنی اور تہذیبی شعور عطا کرتا ہے جس کے تحت مرد و زن مثالی معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ 13-06-2016 کو ڈان میں چھپے View From Abroad میں عرفان حسین کی چھپی تحریر کو پڑھ لیجیے۔ طعن و تشنیع اصلاح کم بگاڑ زیادہ پیدا کرتی ہے۔ مصنفین کا فرض ہے کہ پہلے وہ خود پھر قوم کو نرگسیت کے احساس سے آزاد کروائیں۔ راجہ گدھ میں آگے ملاحظہ فرمائیے:

''ویسے بھی مرد کا عورت کی بھوک سے ڈھکا چھپا لیکن بڑا پرانا رشتہ ہے۔ جب کبھی کوئی مرد کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اس عورت کی بھوک مٹانے کا چسکہ پڑ جاتا ہے۔ پھر وہ اس کی جذباتی بھوک مٹانے کے لیے اس کا سہارا بنتا ہے۔ ذہنی خلا جو بھوک ہی کی شکل ہے ختم کرنے کو اس سے باتیں کرتا ہے اس کی جذباتی بھوک کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔ جسمانی بھوک بچوں کا باعث بنتی ہے اور پھر ان ہی چھوٹی چھوٹی اشتہائیں ختم کرنے میں زندگی صرف ہو جاتی ہے۔

پرانے زمانے میں بھی شوہر اپنی ماؤں سے چھپ کر اپنی نو بیاہتا بیویوں کی ذہنی جذباتی جسمانی بھوک مٹانے اوپر والی منزل میں جاتے تو ان کے ہاتھ میں قلاقند کے دونے اور مولسری کے ہار ہوتے۔ آج بھی جب ملاقات ہوتی تو کوک پلانے کون کھلانے اور بیف برگر اڑانے کے لیے ریستوران میں لے جانا پڑتا ہے۔ کھانے والی کبھی بل ادا نہیں کرتی بلکہ کھلانے والا اسے اپنی نیک نصیبی سمجھتا ہے۔

ماڈرن لڑکی یہ بھید سمجھ گئی ہے کہ بھوک کا دکھلاوا مرد تک پیغام

پہنچاتا ہے کہ اگر وہ کھانے پینے میں سرگرم ہے تو جنسی بھوک میں
بھی مرد سے کم نہ ہوگی۔ وہ ایک سمبل سے اپنے تمام کوائف سمجھا
دیتی ہے۔ اپنی بھوک کونمایاں کرتے ہی آج کی لڑکی مرد کی بھوک
میں برابر شریک ہونے کا وعدہ کرتی ہے۔" صفحہ 89 پر "سیمی کے
جسم کو چھونا میرے لیے حجرِ اسود کو چومنے سے کم نہ تھا۔"

بانو قدسیہ محترمہ نے جب یہ ناول لکھا تب ان کی عمر قریباً 51 یا 52 سال تھی۔ جوش جوانی مدھم پڑ چکا تھا۔ خود لڑکپن میں تمام کھیلیں بشمول چھپن چھپائی کھیل چکی تھیں (دیکھیے راہِ رواں)۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر modernity کی لہر کو سمجھ کر ایسی باتوں کو زمانے کے بدلتے trends سمجھتے ہوئے کچھ لکھتیں مگر مطلب تو شاہ کو خوش کرنا تھا۔ اسی لئے لطیف انسانی جذبات کو اس قدر کرودھتا سے بیان کرتی ہیں۔

صفحہ 68 پر فرماتی ہیں:

"میں تعلیم یافتہ ذہین عورتوں سے نفرت کرتی ہوں۔ کم بخت بلا
کی ذہین ہوتی ہیں۔"

گورے رنگ سے کراہت ملاحظہ فرمائیے۔

"رنگ۔۔۔۔؟۔۔۔۔گورا۔۔۔۔گائے کے دہی جیسا۔"

صفحہ 90 پر اپنی پوری 52 سالہ زندگی کے مشاہدات اور علم و فضل کا نچوڑ کچھ یوں پیش کرتی ہیں:

"میں سوشیالوجی کے طالب علم کی طرح سوچنے لگا کہ جب انسان
نے سوسائٹی کو تشکیل دیا ہوگا تو یہ ضرورت محسوس ہوگی کہ فرد علیحدہ
علیحدہ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ باہمی ہمدردی میل جول اور

ضرورت نے معاشرہ کو جنم دیا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ سوسائٹی اتنی پیچ در پیچ ہوگئی کہ باہمی میل جول ہمدردی اور ضرورت نے تہذیب کے جذباتی انتشار کا بنیادی پتھر رکھا۔ جس محبت کے تصور کے بغیر معاشرے کی تشکیل ممکن نہ تھی۔ شاید اسی محبت کو مبالغہ پسند انسان نے خدا ہی سمجھ لیا اور انسان دوستی کو انسانیت کی معراج ٹھہرایا۔ پھر یہی محبت جگہ جگہ نفرت حقارت اور غصے سے زیادہ لوگوں کی زندگیاں سلب کرنے لگی محبت کی خاطر قتل ہونے لگے۔۔۔ خودکشی وجود میں آئی سوسائٹی اغوا کے شبخون سے متعارف ہوئی۔

رفتہ رفتہ محبت ہی سوسائٹی کا ایک بڑا روگ بن گئی۔ اس جن کو ناپ کی بوتل میں بند رکھنا معاشرے کے لیے ممکن نہ رہا۔ اب محبت کے وجود یا عدم وجود پر ادب پیدا ہونے لگا۔ محبت کے حصول پر مقدمے ہونے لگے۔ ساس بن کر ماں ڈائین کا روپ دھارنے لگی۔ معاشرے میں محبت کے خمیر کی وجہ سے کئی قسم کا ناگوار becteria پیدا ہوا۔"

اس صفحہ پر آگے جا کر محبت کے لئے لگی لپٹی، چکنی چپڑی باتیں الگ رکھ کر محبت کی بیخ کنی اور اس کے خاتمہ کی واضح دہائی دیتی ہیں ملاحظہ فرمایئے:

"آج تک سوسائٹی جرائم کی بیخ کنی پر اپنی تمام قوت استعمال کرتی رہی ہے۔ اس نے اندازہ نہیں لگایا کہ کتنے گھروں میں کتنے مسلکوں میں سارا نقص ہی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ سوسائٹی کا بنیادی تضاد ہی یہ ہے کہ ابھی تک وہ محبت کا علم اٹھائے ہوئے ہے۔ حالانکہ وہ اس کے ہاتھوں توفیق بھر تکلیف اٹھا چکی ہے

جب تک یہ جن دوبارہ بوتل میں بند نہیں ہو جاتا اور اس کے ٹریفک رولز مقرر نہیں ہوتے، تب تک شانتی ممکن نہیں۔ کیونکہ محبت کا مزاج ہوا کی طرح ہے کہیں ٹکتا نہیں اور معاشرے کو کسی ٹھوس چیز کی ضرورت ہے۔"

پس جناب! جو تاثر شروع میں لوگوں نے لیا تھا کہ یہ ڈکٹیٹر نواز ناول ہے۔ اس کی اس سے بڑی شہادت کیا ہوگی۔ ان کے سینے میں بہت ٹھنڈ پڑی ہوگی جب انہوں نے "پروا" میں جنرل ایوب کا نام لے کر اسے ولی صفت حکمران قرار دیا۔ اور دوبارہ پھر یقیناً فتح کے شادیانے بجائے ہونگے جب جنرل ضیاء نے محبت کی بیخ کنی کے لئے حدود آرڈیننس بنایا۔ پھر نوجوان جوڑوں کی جس طرح تذلیل ہوئی اور نکاح نامے نہ دکھانے پر حقیقی میاں بیوی جوڑوں کو بھی تھانوں میں ذلت اٹھانا پڑی اب تاریخ کا حصہ ہے۔ لیکن دونوں ڈکٹیٹرز نے جس طرح ایوان اقتدار کی جان چھوڑی اور مابعد کیا بگاڑ پیدا ہوئے ان کا ذکر یہاں محال ہے۔ ان کو محبت انسانی کو نیست و نابود کرنے کا فارمولا آج تک ہاتھ نہیں لگا ورنہ وہ بھی بتا دیتیں۔ مگر بقول الیگزنڈر ڈوما:

"تم انسان کو مار سکتے ہو، ان کے اعضاء کی قطع و برید کر سکتے ہو۔ انہیں پھانسی چڑھا سکتے ہو انہیں سولی دے سکتے ہو مگر ان کے خیالات پر قابو نہیں پا سکتے۔ تم انہیں جتنا کاٹتے ہو وہ اتنا پھیلتے ہیں یہ دلوں میں جا چھپتے ہیں۔ ان کی قطع و برید سے ان کی جڑیں دور زمین دوز ہوتی چلی جاتی ہیں۔"

بانو قدسیہ محترمہ نے ایک سوشیالوجی کے طالب علم سے محبت کی پیدائش پر جن خیالات کا اظہار کروایا ہے۔ وہ مفروضہ اگر، مگر، ہوگا وغیرہ کے الفاظ استعمال کر کے اپنی لاعلمی اور غیر تحقیقی سوچ کی عکاسی کی ہے۔ جب تھیوری پیش کرتے ہوئے تیقن کی کمی ہو تو ایسی تھیوریاں نقصان کرنے کے بعد اپنی موت آپ مر جاتی ہیں جبکہ پر یقین تھیوریاں

قانون کا درجہ اختیار کر کے تاریخ کے خاص دور میں انسانوں کی خدمت کر کے جدید معاشرتی تقاضوں کے مطابق نئے اور اپنے سے بہتر اصولوں کو جگہ دے کر ریٹائر ہو جاتی ہیں۔

ان کو جب یہ ہی علم نہیں کہ محبت کی ضرورت معاشرتی گروہی جڑت کے بعد ہوئی یہ اس سے پہلے بھی انسانوں میں اُنس کی شکل میں موجود تھی تو پھر یہ اگر، مگر، ہوگا، ہو سکتا ہوگا وغیرہ کیوں؟ تو آیئے سنیئے انسانی معاشروں کے آغاز پر محض دو کتابوں کے حوالے سے بات ختم کروں گا جن صاحبانِ ذوق کو شوق ہو پڑھ لیں۔

1. The Golden Bough By Sir James Frazer

2. Origins of Family, Private Property & State By Fredrick Angles.

اُنس، پیار اور محبت انسانی دماغ کے اعلیٰ ترین جواہر میں سے ہیں اور یہ اپنی پوری قدر و قیمت کے ساتھ انہی معاشروں کے مرد و زن میں ظاہر ہوتے ہیں جن کی نرگسیت خاک ہو چکی ہو، جہاں دانشور ادیب اور رہنما، اساتذہ اور سائنسدان اپنی ذاتی اغراض سے بہت بلند ہو کر سوچنے کی جرات رکھتے ہوں۔ وہاں بانو قدسیہ محترمہ کے ناول کے مرد حضرات اپنی جنسی قوت کو بے راہ روی پر نہیں لے جاتے اور عورتیں اپنی معاشرتی برابری کے احساسات سے تہی دامن ہو کر محض خود کو ایک جنسی تسکین کے کھلونے کے طور پر پیش نہیں کرتیں۔ بلکہ ایسے مطمئن معاشروں میں مرد و زن اپنے پورے علم و ہوش و حواس میں جوڑے بناتے ہیں اور پھر تا عمر وفاداری سے زندگی گزار کر اپنی نسل چھوڑ کر پہلے سے بھی اعلیٰ معاشرتی اقدار قائم کر کے جہان فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ محترمہ نے اور بھی کئی جگہ فلسفہ محبت پر بحث کی ہے مگر مندرجہ بالا اقتباس کے بعد ان کی متضاد لن ترانیوں پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔

○

باب 10

اپنی من مانی ۔۔۔ پرندوں کی زبانی

حرام وحلال کی تھیوری جو کہ پروفیسر سہیل نے اس ناول میں پیش کی ہے وہ بڑی واضح زبان میں ہے۔ بانو قدسیہ محترمہ نے اس بابت اپنی مافی الضمیر بیان کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن C-121 داستان سرائے کی روایت کو چھوڑ نہ سکتی تھیں۔ لہٰذا پرندوں کی کانفرنس کے تین لمبے چوڑے ابواب نے ناول کو اچھی خاصی طوالت بخشی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بانو قدسیہ محترمہ نے راجہ گدھ کی وجہ تسمیہ کی وضاحت بھی دینا تھی ۔ تیسری بات یہ نکلتی ہے کہ انہیں وہ سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا کہ راجہ گدھ میں گدھ کو دیوانگی کے دورے کیوں پڑنے شروع ہو گئے تھے۔۔۔ جو کہ خالصتاً ان کی اپنی ذاتی اختراع ہے۔ چوتھی دلیل یہ بنتی ہے کہ پرندوں کے ابواب کا اضافہ کرنے سے ناول میں ایک زبردست چاشنی اور ابہامی الجھاؤ پیدا کرنا تھا تاکہ قاری جب ماڈرن پڑھی لکھی مغرب زدہ لڑکیوں کو بے حیا سمجھنا شروع ہوتا ہے، محبت کے خلاف اثرات قبول کرتا ہے تو کبھی چندرا کے ماحول میں جا کر پچھلی باتیں بھول جائے یا پھر بابوں کی پراسراریت میں کھو جائے۔ اگر کوئی ناول کے مرکزی خیال کے خلاف دلائل سوچنا شروع کرے تو یکدم پرندوں کی میٹنگ میں الجھ کر رہ جائے۔

بانو قدسیہ محترمہ پرندوں کی زبان سے سماجی مسائل پر گفتگو کا تجربہ اپنے ایک افسانہ ''کال کلچی'' میں بہت عرصہ پہلے کر چکی تھیں۔ لیکن راجہ گدھ میں پرندوں کے

کرداروں کا استعمال اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور ایک نیم علامتی ناولٹ کی شکل میں علیحدہ سے بھی شائع ہوسکتا تھا۔ انہوں نے کم وبیش 50 صفحات پرندوں کی کانفرنس میں استعمال کئے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ کانفرنس صرف اور صرف اپنی نسل کے اراکین میں ممکن ہے۔ یہ بالکل غیر فطری ہے کہ اونٹ اور کھوتے۔ یا کوے اور انسان۔ یا مچھلیاں اور کچھوے۔ یا لگڑ بھگڑ اور سانڈ یا کوے اور چڑیاں۔ یا باز اور کبوتر۔ یا ہنس راج اور سیمرغ مل کر بیٹھیں اور اپنے کسی مسئلہ کا حل نکال لیں۔ یہ اعجاز صرف حضرت انسان کو حاصل ہے کہ یہ کالا، گورا، پیلا، گندمی، بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کے باوجود اکٹھے مل کر بیٹھتا ہے اور اپنے درمیان صلح یا دشمنی کی وجوہات تلاش کرسکتا ہے۔ کوئی ٹھوس معاہدہ کرسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دیکھا گیا ہے کہ عالمی لٹریچر میں جانوروں اور پرندوں یا پھر ایسی اَن دیکھی مخلوقات کی زبان سے ادیب حضرات وہ باتیں کہلوا دیتے ہیں جو انسان کی زبان سے کہلوانے پر کسی تعزیری ردعمل کا اندیشہ ہو۔ ایوب خان کو ظاہراً ولی تو بانو قدسیہ محترمہ نے قرار دیا تھا۔ جنرل یحییٰ خان کو جماعت اسلامی نے باقاعدہ امیر المومنین declare کیا۔ اب ان دو بڑے تجربات کے بعد بانو قدسیہ محترمہ کو جنرل ضیاء کی شکل میں ایک نجات دہندہ نظر آیا تو تھوڑا محتاط ہو کر پرندوں کی زبانی یہ اعزاز دینے کا اشارہ کردیا۔

پرندوں کی کانفرنس میں 3 واضح اشارے موجود ہیں۔ نمبر ایک انسان کی بے پناہ سائنسی ترقی کی صورت میں ایٹم بموں سے نفرت کا اظہار۔ نمبر دو گدھ کی سرشت میں بوجہ انسانی خون منہ میں ٹپک پڑنے پر تبدیلی۔ نمبر تین ایک امیر المومنین یا پھر ایک مقدس دیوانہ کے ظہور کا انتظار جو انسانیت کے دکھوں کا نجات دہندہ ہو۔ پرندوں کے درمیان گفتگو انتہائی دلچسپ اور پر مغز ہے۔ ماحول کی منظر کشی انتہائی رومانٹک ہے۔

چونکہ قرآن حکیم میں اماں حوا اور بابا آدم کو ایک خاص درخت کے قریب نہ جانے

اور اس کا پھل نہ کھانے کا حکم تھا وہ درخت جو بھی پھل دیتا تھا رب تعالیٰ کو اس کے حرام یا حلال قرار دینے کی منشا نہ تھی بلکہ بس اسے نہ کھانے کی منشا تھی۔ اب وہ درخت کون سا پھل لیے ہوئے تھا؟ اس کا فیصلہ نہ کرنے میں یا اس پر حکم جاری کرنے میں علماء آج تک محتاط ہیں۔ سورہ بقرہ میں اس مسئلہ پر سیر حاصل مواد موجود ہے۔ فرض کر لیا اس خاص درخت کا پھل کھانے کی ممانعت تو تھی۔۔۔ مگر اس کا پھل بالذات حرام ہونا ثابت نہیں ہو! لیکن پرندوں کی زبانی بانو قدسیہ محترمہ خاص گندم کے دانے کو انسانوں میں منفی لہروں کی پیدائش کا سبب بتاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ 361:

''سرخاب اٹھا اور خطیب کی طرح گویا ہوا۔۔۔ صاحبو! رزق حلال کا مسئلہ اولاً جنت میں طے ہو چکا ہے۔ پہلے بابا آدم اور اماں حوا حفظ و اماں سے جنت میں رہتے تھے اور بموجب حکمِ الٰہی بہشتی لباس پہنے تھے۔ اس وقت ان پر بہشت کا ہر میوہ جنت کا ہر پرندہ ہر جانور حلال تھا۔ لیکن وہ حرام کھانے کے مرتکب ہوئے۔ حرام کیا ہے؟ وہ جس سے منع کر دیا جائے۔ حضرت آدمؑ نے وہ گندم کا دانہ کھایا جس کی ممانعت کی گئی تھی۔ پہلی بار ان کے جسم میں منفی لہریں داخل ہوئیں۔ اب تک ان کی سرشت صرف نیکی کی طرف راغب تھی۔ اب اس میں تضاد شامل ہوا۔'' ''اس بات سے تیرا کیا مطلب ہے۔ سرخاب وضاحت کر۔۔۔'' چنڈول بولے۔ ''بات صرف اتنی ہے۔۔۔ کہ جو کوئی رزق حرام کھاتا ہے وہ یا خود دیوانہ ہوتا ہے یا اس کے آنے والی نسلیں بعد کو دیوانی ہو کر رہتی ہیں۔'' اب چیل جاتی بہت خوش ہوئی اور چلائی ۔۔۔ ''جنگل بدر۔۔۔ جس طرح حضرت آدم جنگل بدر ہوئے ویسے

ہی۔۔۔۔۔۔ وہی سزا۔۔۔۔۔۔ جنگل بدر۔۔۔۔۔ جنگل بدر۔۔۔۔۔۔"

لیجیے! یہاں بانو قدسیہ محترمہ وہ حکم جاری کر رہی ہیں کہ حضرت آدم تا آخری انسان سب ہی دیوانے اور پاگل ہیں اور جسم میں ناپاک لہو لیے پھرتے ہیں۔

لیکن ان سے باتوں باتوں میں تصوف کے تحت صوفیاء اور وحدت الوجود کے تحت تلاش رب والوں کو بھی رگڑ ادے ڈالا ہے۔ یعنی ان کے بقول دیوانگی کی دو اقسام ہوتی ہیں ایک مثبت اور ایک منفی۔ چلو ہم دلیل کی خاطر مان لیتے ہیں مثبت پاگل پن قابل تعریف ہے اور ہم سب انسانوں کو وہی اختیار کر لینا چاہیے۔ دیکھئے نتیجہ پھر بھی کیا نکلے گا صفحہ 465 پر سائپرس کے ایک بادشاہ کی تماثیل ہے جو ہفت اقلیم کا مالک تھا۔ وہ شاندار حکمرانی کرتے ہوئے مثبت دیوانگی کا شکار ہوا اور انجام کیا ہوا ملاحظہ فرمائیے۔ یہ تمثیل مینا کی زبانی ہے:

> "دوسری صبح اس کا برق رفتار گھوڑا کھڑکی کے پاس آکر ہنہنایا تو میری آنکھ کھلی۔ وہ مر چکا تھا۔ اس نے اپنے خنجر سے خودکشی کر لی تھی۔ ہر آئینے میں ایک خنجر کا عکس تو موجود تھا لیکن کسی شیشے میں اس صاحب جمال کا عکس نہ تھا۔ اس کی خودکشی۔۔۔۔۔۔ خودکشی جو دیوانگی کی دوسری شکل ہے۔ کیا اس کی سرشت کی وجہ سے نہ تھی۔ کیا اس کا تعلق اس تلاش سے نہ تھا جو کثرت میں وحدت کو تلاش کرتی ہے۔"

لیجیے جناب! بانو قدسیہ محترمہ نے تصوف کے بلند ترین محبوب ترین خیال ہمہ اوست یا وحدت الوجود کے تحت خدا کی تلاش کو بھی غلط قرار دے دیا۔ اشفاق احمد خان مرحوم اور بانو قدسیہ محترمہ تا عمر جن بابوں سے اکتساب فیض کرتے رہے۔ اپنی گنجلگ

متصوفانہ کہانیوں کے پلاٹس چراتے رہے۔ جن بابوں کے ڈیروں سے پاک لنگر روزانہ منگوا منگوا کر کھاتے رہے۔ ان کو بھی نہ بخشا انہوں نے۔

اب دوبارہ دیکھتے ہیں کہ گدھ بیچارہ اپنی سرشت تبدیل ہونے سے پہلے کیا کوئی پھل فروٹ کھا کر زندہ رہتا تھا جو انسانی لہو کی بوندیں چونچ میں ٹپک پڑنے کے بعد پاگل اور دیوانہ ہوا پھر مردار کھانے لگ گیا۔

صفحہ 25 پر پرندوں کی پہلی میٹنگ کے دوران جلسے کی صدارت کے لیے تمام پرندے ہُما کا انتظار کر رہے ہیں تو کچھ شکاری ہوا بازیوں بیان کرتے ہیں:

> ''قیامت کے آثار قریب ہیں اور یہ قیامت خود انسان کے ہاتھوں برپا ہونے والی ہے۔ دنیا کو قیامت سے بچانے کے لیے کسی مرد مومن کی تلاش ہے اور اس بار ہما بادشاہ چناؤ نہیں بلکہ نجات دہندہ کو کھوجنے کے لیے نکلا ہے۔''

اب مردِ مومن مردِ حق جنرل ضیاء الحق کا نعرہ ان سے ماخوذ ہو گا۔ چناؤ نہیں بلکہ کھوج کے تحت مسند پر بٹھانا مقصود تھا۔ پھر اس نے چناؤ کی بجائے ریفرنڈم کے ذریعے اپنا انتخاب کروالیا۔

پھر فوراً اس صورت حال کو بیلنس کرنے کے لیے اگلی سطروں میں پرندوں کی زبانی یوں کہلوا دیتی ہیں:

> ''کچھ پرندے سمجھتے تھے کہ ہما اب صوفی منش ہو چکا تھا۔ وہ انسان کو اتنی بار اللہ کی خلافت کا مشورہ سنا چکا تھا لیکن ہر بار خلیفہ صرف بادشاہ بن کر بیٹھ جاتا۔۔۔۔۔۔ ہُما کو اس بات کا اتنا دکھ تھا کہ اب وہ اشرف المخلوقات کے سروں پر سے اڑنا گوارا نہیں کرتا۔ اور کہیں چھپ کر وقت گزارتا ہے۔''

پھر اگلے ہی صفحے پر اپنا دامن پاک کرنے کے لیے تمام انسانوں کو بطور اشرف المخلوقات ہونے آزاد مرضیوں کا مالک قرار دیتی ہیں۔ لیکن یہ تجاہل عارفانہ کا بہت بڑا اظہار ہے۔ ان کے کہہ دینے سے انسان آزاد تو نہیں رہتے۔ جب تک ظالم و جابر سلطانوں کو بزور نہ روکا جائے گا۔ جب تک انصاف کا بول بالا نہ ہوگا۔ جب تک ریاستی ادارے چلانے والوں کو طے شدہ قانون کے تحت عوام کا خادم بننے کا پابند نہیں کیا جائے گا اجتماعی آزادی شخصی خواہشات کی مٹھی میں مقبض ہی رہے گی۔

پھر صفحہ 34 پر نجد کی رہنے والی ایک مینا یوں کہتی ہے۔

> ''انسان کی قوت اس کی جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے، وہ جانوروں اور پرندوں کی طرح محض نسل بڑھانے کو اپنی جنسی طاقت استعمال نہیں کرتا، بلکہ طاقت کے اس مشکی گھوڑے کو اپنی رانوں میں دبا کر رکھتا ہے۔ پھر یہی برق رفتار راستے دین اور دنیا کی مسافتیں طے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس گھوڑے پر انسان کے زانو سختی سے کسے ہوئے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے۔ ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے اور وہ پاگل کہلاتا ہے۔ دنیا کا عرفان ہو تو شاعری، مصوری، موسیقی آرٹ جنم لیتا ہے۔ دنیا درکار نہ ہو تو قوت تیز ہو تو عرفان کی حدیں چھو لیتا ہے اگر یہ قوت مقبض ہو جائے تو خودکشی کرتا ہے۔۔۔ عشق لاحاصل ہو جائے اور گھوڑا سوار کو گھسیٹے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے پتھر مارتے ہیں، زنجیروں سے باندھتے ہیں۔ دیوانگی کی اصل وجہ یہی لاحاصل ہے آقا۔''

لیجیے جناب! آپ محترمہ جانور بدل بدل کر، کردار بدل بدل کر انداز بدل بدل کر

ایک ہی بات گھوٹے جا رہی ہیں۔ ہم قارئین کو احمق اور بودا بنانے، تقدیر پرستی اور بے یقینی کی دلدل میں پھنسانے کے لیے ایک ہی حربہ کو موقع اور رنگ بدل بدل کر آزماتی ہیں۔ کسی ایک جگہ بھی انسانی معاشرہ یا پاکستانی معاشرہ کے مصائب کی وجہ۔۔۔ان خونخوار درندہ نما لیڈران۔۔۔ جاہ پرست انسانوں کی نشاندہی نہیں کرتیں۔ قارئین کو ایک واضح لائحہ عمل نہیں دیتیں کہیں نہیں بتاتیں کہ وجہ دیوانگی ریاستی مشینری کا بے پناہ جبر بھی بنتا ہے۔ زمانے کی رفتار کو شناخت نہ کر کے صرف ماضی کے مزاروں کی پرستش بے عملی پیدا کرتی ہے اور منزل کو واضح شناخت کرنے والی آنکھیں دھندلا جاتی ہیں لیکن اس میں ان کا بھی قصور نہیں یہ داستان سرائے کی باسی تھیں۔ کبھی تصوّف اور کبھی اسکی بھی تنقیص کرتی نظر آتی ہیں۔ راجہ گدھ میں انہوں نے تضادات اور کج فہمی کی وہ معجون مرکب تیار کی ہے کہ عام قاری کی پکڑ سے باہر ہو جاتی ہے۔ درست ہی کسی نے کہا تھا۔ بال کٹا جوگی اور پسی ہوئی مرکب دوائی کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ عوام کی مزید بے عملی اور روح کی مردگی کے لیے اب میدان اسرار کے بادشاہ بابا یحیٰی کے حوالے کر کے خود ''راہ رواں'' کی تدوین نو میں شاید مشغول ہیں کیوں کہ ''راہ رواں'' کے صفحہ 179 پر کتاب خریدنے والوں کو چکرا کے رکھ دیتی ہیں اور قاری اپنے آپ کو منہ کھلا احمق اور ہونق سمجھنے لگ جاتا ہے یہ بھی وضاحت نہیں یہ ایک صفحہ کا مضمون اپنے ماموں پرویز (ریزی) کے لیے کس نے لکھا تھا۔ غالباً قیاس ہے کہ بانو قدسیہ محترمہ کے تیسرے بیٹے اثیر خاں نے لکھا ہوگا کیونکہ اس میں بینکنگ Terminalogy ہے:

> ''میرا التماس ہے کہ اس کا پہلا باب پڑھ لیجیے اور اگر ممکن ہو تو پورا پڑھ لیجیے۔ اس کتاب کو خریدنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس وقت جو کاپی آپ کے ہاتھ میں ہے، وہ ہم نے ایڈیٹنگ کر کے بنائی تھی لیکن ایک کلرک کی نااہلی کے باعث دوسری کتابوں میں اسے ملا

دیا، جس کی وجہ سے یہ کتاب بک سٹال پر پہنچ گئی۔ دوسرے آپ کی ذہانت کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے قیمتی سرمائے میں سے اسے خرید لیا ہے جو درحقیقت pre-editing کی کاپی ہے۔"

تو یہاں آپ زیادہ سے زیادہ اسے مذاق قرار دے کر خاموش ہو جائیں گے۔ اسی طرح بانو قدسیہ محترمہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا وہ Rape سے ملنے والی شہرت کو بھی اللہ ہی کی طرف منسوب کر سکتی ہیں۔

"باری تعالیٰ ہمیشہ نیکی سے نیکی کے نتائج اخذ نہیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ نیک اعمال کے نتیجے میں برے حالات بھی سامنے لاتا ہے اور کبھی کبھی برائی بھی کار آمد شاندار مستقبل کی ضامن بن جاتی ہے۔"

"آج 2007ء ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ "مختاراں مائی" نے کس عروج کو چھو لیا ہے۔ وہ Rape کا شکار ہوئی۔ پتہ نہیں کیوں اور کیسے پاکستانی میڈیا نے اور پھر امریکی الیکٹرونک اور پریس میڈیا نے اسے آسمان پر چڑھا دیا۔ حتیٰ کہ وہ یو۔ این۔ او کی مہمان بن گئی اور شہرت کا وہ مقام بھی پا لیا جو محنت اور مشقت کاموں سے نکل نہ سکتا تھا۔"

اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ تا عمر کوئی ٹھوس راہ عمل دکھانے اور کوئی بہترین معاشرتی فلسفہ دینے میں ناکام رہیں۔ ڈِھل مِل، تلقین شاہی، غیر یقینی اور نان سائنٹیفک سوچ ایسے انسانوں کے مرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔

اب ذرا ان کے فلسفہ Genetic Evolution کو بھی منطق کی سان پر رکھ کر پرکھ

لیتے ہیں۔اس کے لیے میں ایک ڈایا گرام سے اس کی وضاحت چاہوں گا۔

Genetic Evolution

abnormality........> Super normal stage.........>

super duper normal stage.......>???

اولاً ارتقاء کا عمل جسمانی اور سماجی طور پر ایک حقیقت ہے۔سماج کی ترقی کے لاتعداد شواہد تاریخ اور آثارِ قدیمہ، رواجات اور ثقافت سے ثابت شدہ ہیں۔جسمانی ارتقاء یا ذہنی ارتقاء بھی ہو رہا ہے۔اب موجودہ نسلِ انسان کو اگر یہ abnormal قرار دیتی ہیں اور انسانیت کی نجات اگر super normal stage کو قرار دیتی ہیں تو پھر اس advanced stage کے اپنے معروضی مسائل ہونگے کیونکہ evolution کا عمل جاری وساری ہے اور تا قیامت رہے گا۔پھر انسانوں کو ایک super dupper normal سٹیج کی ضرورت ہو گی۔اگر وہ سٹیج بھی achieve ہو جاتی ہے تو پھر اس کے اپنے مسائل ہونگے لہٰذا یہ خواہش تب تک رہے گی جب تک قیامت نہیں آجاتی اور حضرت انسان کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتا۔یا پھر انسان ہی اپنی نسل کشی کر کے اس کرّے سے ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ فارمولا اس لیے سائنسی ہے کہ ہم ہزاروں سال سے موجود قدیم آثار سے جب اپنے آباء کی تہذیبوں کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں بعض اوقات مذاق کی حد تک نا قابل قبول لگتی ہیں مگر جب بہ غور ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو علم حاصل ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تب تب تہذیب انسانی اپنے عروج و ترقی پر نازاں ہوگی۔ ان کی جدوجہد اور نسل درنسل ہر طرح کی وراثت منتقلی سے ہی ہم آج بام عروج کو چھو رہے ہیں لیکن یہ تہذیبی دور بھی اپنی یادگاریں چھوڑ کر اپنے عروج پر رواں دواں رہے گا اور ہماری آنے والی نسلیں ہمارے آثار کو بچوں کے سلیبس میں پڑھا رہی ہونگی۔ ہر تہذیبی، معاشرتی، سماجی، سیاسی اور سائنسی دور کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔قدیم یا ہمارے

آباء کی تہذیبوں نے بھی اپنی بقاء کے لیے سخت جدوجہد کی ہوگی۔ تاریخ اقوام میں صرف وہ ادوار کامیاب اور سنہرے سمجھے گئے جن جن ادوار میں انصاف قائم ہوا۔ انسان کی محض اس کے انسان ہونے کی وجہ سے تکریم ہوئی۔ جن جن ادوار میں دانشوروں، حکما اور سائنس دانوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی آزادیاں ملیں۔ اقوام عالم کی تاریخ میں آباء نے دور آشوب بھی سہے مگر پھر یہ جری اور نعرہ حق بلند کرنے والے علماء اور دانشور ہی تھے جنہوں نے راہنمائیاں فراہم کیں اور یہ عام عوام ہی تھے جنہوں نے طوق غلامی کو کبھی قبول نہ کیا اور جانوں کے نذرانے پیش کر کے آنے والی نسلوں کے لیے درخشاں مستقبل کو تعمیر کرنے کی راہیں متعین کیں۔ ہر دور کے پر آشوب دنوں میں حقیقی دانشور وہ ہی مانے گئے جنہوں نے باطل کے خلاف سوچا سمجھا اور لکھا۔ بانو قدسیہ محترمہ کا ناول راجہ گدھ یا سارے کا سارا ادبی کام زُود نویسی کی بڑی مثال تو ہوگا لیکن باطل کے خلاف عوام کا مددگار ادب کبھی نہ سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ تاریخ کی مار سے بچالے تو ادیب اور اس کا ادب دونوں زندہ رہتے ہیں ورنہ قصہ پارینہ بن کر بھلا دیے جاتے ہیں۔

○

باب 11

تھیسز اینڈ اینٹی تھیسز

بانو قدسیہ محترمہ نے اپنے ناول میں 2 واضح thesis قائم کیۓ جن کے anti thesis بھی پھر اسی ناول میں لکھ دیۓ۔ دو اور ایسے thesis پیش کیۓ جن پر سارے ناول کی عمارت کھڑی تھی۔

تھیسز ۱:

آپ نے بڑی ہوشیاری سے ماڈرن تعلیم یافتہ لوگوں اور جدید علوم کی بنیاد پر انسانی معاشروں کی خاص طور پر سائنس میں ترقی کی تذلیل کی ہے۔ پورے ناول میں جابجا ماڈرن تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تنقیص اور خاص طور پر لڑکیوں کی تذلیل کرتی ہیں۔ انہیں فلسفہ، عمرانیات، نفسیات اور لٹریچر پڑھنے کے بعد آزاد خیال اور آوارہ مزاج بتاتی ہیں جبکہ anti thesis کے طور پر امتل اور عابدہ جیسی ان پڑھ یا نیم خواندہ خواتین کے منہ سے بڑے بڑے عالمانہ جملے ادا کرواتی ہیں۔ معاشرہ کی خوبصورتی ناخواندگی یا پھر نیم خواندگی میں ثابت کرتی ہیں۔

تھیسز ۲:

ناول میں پروفیسر سہیل کو جگّت استاد دکھایا گیا ہے۔ جو نہ صرف ماڈرن علوم سے بہرہ ور ہے بلکہ روحانی علوم اور یوگا میں بھی ماہر دکھایا گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ بہت باریک بینی سے یہ راز کھل کر سامنے آتا ہے کہ بانو قدسیہ محترمہ درحقیقت پروفیسر سہیل

کے ذریعے یوگا کی افادیت نہیں بلکہ اس کی نفی کروا رہی ہیں۔ پروفیسر سہیل اپنے شاگرد قیوم کو بار بار یوگا کے مختلف طریقوں سے متعارف کرواتا ہے اور ان کی پوری پوری تعریف کرتا ہے لیکن anti thesis تب قائم ہوتا ہے جب قیوم پر ان ورزشوں کے بالکل کوئی مثبت اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ thesis اور anti thesis کی انتہا وہاں نظر آتی ہے جب اسے تانترک یوگا سے آگاہ کرتا ہے جو کہ انتہائی قبیح طریقے سے کسی شادی شدہ عورت سے جنسی ملاپ کر کے جسمانی شکتی کو بحال کرنے کا نسخہ ہوتا ہے۔ قیوم بغرض علاج عابدہ جو کہ ایک شادی شدہ خاتون ہے کو بچہ دینے کا لالچ دے کر اپنی جسمانی قوت یا کنڈالتی شکتی کو جگانے کے لیے اس سے بدنی ملاپ کرتا ہے مگر جسمانی قوت بحال کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اگر آپ غور فرمائیں تو اس سارے کھیل میں آجا کے یوگا کی اہمیت وافادیت پروار نظر آتا ہے۔

اب میں دو ایسے تھیسز کا ذکر کروں گا جو بہت توجہ کے طالب ہیں نمبر ایک آپ کے علم میں ہے کہ راجہ گدھ کا مرکزی خیال بانو قدسیہ محترمہ کا رزقِ حرام کے اثرات کا اپنے انداز میں پرچار کرنا اور پھر اس حرام رزق کے انسانی جسم پر اثرات اور جینز میں تبدیلی دکھانا ہے۔ لیکن اسے من گھڑت تھیسز کہہ لیں۔ مفروضہ کہہ لیں یا بقول بانو قدسیہ محترمہ تھیوری کہہ لیں۔ اس کا ذکر بانو قدسیہ محترمہ کے مابعد راجہ گدھ کسی اور ناول یا افسانہ میں نہیں ملتا۔ جلد ہی ادراک ہو گیا ہو گا کہ ایک غلط اور مخمصہ پیدا کرنے والی تھیوری نے معاشرہ کو فائدہ تو شاید نہ دیا لیکن بہت سارے نوجوانوں کو قیوم بننے، بہت سارے پروفیسروں کو دوغلا پروفیسر سہیل بننے پر ضرور اکسایا ہو گا۔ لہٰذا ان کا اپنے مابعد راجہ گدھ کسی بھی ناول یا افسانہ یا ''مرد ابریشم'' اور ''راہ رواں'' جیسی سوانح عمریوں میں رزق حرام کی تھیوری کو دوبارہ تازہ نہ کرنا بلکہ مکمل خاموشی اختیار کر لینا اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے محبوب thesis کا خود ہی انٹی تھیسز پیش کر دیا۔

میرے علم کے مطابق ان کا آخری ناول ''حاصل گھاٹ'' ہے۔ جس میں انہوں نے ایک نئی تھیوری پیش کی ہے یعنی فلسفہ ''فلاح'' جو رزق حلال کی تھیوری کا قاطع

ہے۔ مان لیا ایک ادیب کا اپنی عمر اور تجربہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں مگر خیالاتی قلابازیوں کی اتنی بڑی مثال شاید پاکستانی ادب میں آپ کو کسی اور ادیب میں نظر نہ آئے۔

آخری مبہم اور ان ڈائریکٹ ذات باری تعالیٰ کا اثبات ونفی کا تھیسز ہے۔ عابدہ اور امتل پھر بابوں کے ذریعے پھر پرندوں کی زبانی جنت میں حضرت آدمؑ اور اماں حوا کا واقعہ بیان کرنا اس ناول کو ایک طرح سے زبردست مذہبی رنگ اور ''حاصل گھاٹ'' صفحہ 288 سے اقتباسات پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمایئے تاعمر اپنے آدرش بدلنے والے کیا کیا رنگ دکھاتے ہیں!

''۔۔۔۔۔۔۔۔ جو آدمی کہیں بندھا ہو، وہ آسانی سے لبرل نہیں ہوسکتا۔۔۔۔ میں سوچتا رہا کہ کمیونزم نے فیل ہو کر فرد کے لیے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔ اب جمہوریت اور سرمایہ پرستی کے علاوہ کوئی مذہب قابل تقلید نہیں رہا۔''

''اتنا نہ سوچا کرو برخودار۔۔۔۔ جوانی عمل کا پیریڈ ہے۔۔۔تو ہمات کے پیچھے بھاگنا اور سوچ کا بیوپار میری عمر کا مشغلہ ہے۔۔۔۔۔ کھاؤ پیو اور بُلے لوٹو۔''

''اتنے سارے مظالم جو انسانوں پر ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے مجھے لبرل کر دیا ہے۔۔۔۔ میں اتنا لبرل ہو گیا ہوں بابا جان۔۔۔ کہ اب میں خدا سے بھی آزاد ہو گیا ہوں۔ میں اس خدا کے تصوّر کو نہیں مانتا جو حدود تو مقرر کرتا ہے' تقدیر تو لکھتا ہے۔۔۔ لیکن پکارنے پر مدد کرنے نہیں آتا۔۔۔ اب میں اتنا لبرل ہو گیا ہوں کہ میں ہر انسان کے عمل کو اس کی ذاتی ذمہ داری تصوّر کرتا ہوں۔۔۔۔ اس طرح وہ اسے ضبط نفس کو اپنے پر عائد کرتا ہے جو کوڈ وہ خود بناتا ہے، وہ ایسی حدود رکھتا ہے جو اس کی خود ساختہ ہیں۔''

لیجیے جناب ! اس اقتباس کو پڑھ کر 1978ء میں چھپنے والے اکرام اللہ کے ناولٹ گرگِ شب پر سے بھی پابندی اُٹھ جانی چاہیے۔ میرے نزدیک اس کا وہ ہی پیراگراف قابل گرفت تھا جس مین ناولٹ کا ہیرو ظفر بطور خدا کا ایک بندہ اپنے خدا سے سخت الفاظ میں مخاطب ہوتا ہے۔ لیکن ٹھیک اگلے پیراگراف میں التجا کرتا ہے کہ اپنی بھٹکی ہوئی بھیڑوں جیسی انسانیت کی بھی کوئی خبر لو۔

مندرجہ بالا پیراگراف میں بانو قدسیہ محترمہ ناول کے کردار عبدگل کے منہ سے اور اپنے زور قلم سے خدا سے برگشتگی اور ناراضی کے کلمات تو کہلوا دیتی ہیں مگر آگے جا کر کہیں بھی خدا کی مدد یا رحمت یا توجہ کا ذکر نہیں کرتیں۔ اس لحاظ سے حاصل گھاٹ کا یہ پیراگراف گرگِ شب کے پیراگراف کے ہم پلہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسے پڑھ پڑھ کر عوام کا ایمان خراب نہیں ہو رہا تو پھر اکرام اللہ کے گرگِ شب جو اپنے فلسفہ اور سماجی رہنمائی میں ایک حکم کی سی طاقت رکھتا ہے اسے بھی چھپنے اور پڑھنے کی آزادی مل جانی چاہیے۔

صاحبانِ عقل و دانش ! بانو قدسیہ محترمہ نے صفحہ 287 کے پیراگراف میں ہی کمیونزم کے خاتمہ یا موت پر نوحہ بھی کیا ہے لہٰذا ان کا افسانہ ''روس سے معذرت کے ساتھ'' اپنے thesis میں خود بخود دپٹ کر رہ جاتا ہے۔ قصہ مختصر بانو قدسیہ محترمہ کا ناول راجہ گدھ جن جن یونیورسٹیوں میں نصاب کا حصہ بن چکا ہے اپنے غلط نظریات اور بے سروپا معاشرتی منظرکشی، غیر سائنسی تھیوری (بلکہ مفروضہ) حرام وحلال، غلط عنوان، بے سروپا بابا ازم، ماڈرن تعلیم کی مخالفت اور تمام کرداروں کی غیر حقیقی زندگیاں دکھانے پر فوراً نصاب سے خارج کیا جانا چاہیے جو نوجوان طلبہ و طالبات کو ماسوائے ذہنی خلفشار اور درمیانے درجہ کی زبان سکھانے کے علاوہ کسی اور طرح سے بھی ہرگز فائدہ مند نہیں۔ ویسے بھی اس میں کوئی ٹکسالی زبان کی لغات بھی نہیں پائی جاتی۔

○

باب 12

مدرّس نقاد کے باب میں

قوموں کی حکمران قیادت ان قوموں کے اجتماعی ضمیر (collective conscience) کی نمائندہ ہوتی ہے۔ سیاسی عمل کے تحت غالب اجتماعی ضمیر اپنی قیادت کو حکمرانی کا حق دیتا ہے۔ وہ اچھا ہو تو بار بار حکمرانی کے حق کو استعمال کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اگر نہیں تو پھر سیاسی عمل کے تحت دوبارہ اجتماعی ضمیر اپنی قیادت کو بدلنے کا حق رکھتا ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس اجتماعی عوامی ضمیر کو trained ہونے اور پھر اپنی will کو ظاہر کرنے کے مواقع تعطل کا شکار رہے ہیں۔ یہ ناول بھی ایسے ایک تعطل کے دورانیے میں لکھا گیا جب اجتماعی عوامی ضمیر کی will and wishes کو بزور دبا کر فرد واحد کے فیصلوں پر ملک کو چلایا جا رہا تھا۔ ایسے ہی تعطل کا شکار دور اپنے عمر کے ادیبوں کو روشن ضمیری کے مظاہرے کا زبردست موقع فراہم کرتا ہے۔ اجتماعی ضمیر پر طرح طرح کی پابندیوں کی صورت میں اعلیٰ انفرادی ضمیر حرکت میں آتا ہے اور حصار میں آئے ہوئے اجتماعی ضمیر کی پرزور نمائندگی بذریعہ اپنی تحریوں کے کرتا ہے۔ ایک موقع پرست قسم کا انفرادی ضمیر بھی ایسے سیاسی سماجی تعطل کے دور کو اپنے لئے اپنی بے ضمیری اور کمزوردلی کے باعث شاہ پرستی کا اچھا موقع جان کر پوری طرح متحرک ہو جاتا ہے اور رواں دواں سیاسی وسماجی عمل کو معطل کرنے والا مہرہ بن جاتا ہے۔ ادباء، دانشوروں اور باضمیر صحافیوں کے بعد سب سے بڑا دانشور طبقہ جن کے خیالات نوجوان ذہنوں میں تیزی سے نمود ونفوذ پذیر ہوتے

ہیں وہ ہے یونیورسٹی کے اساتذہ۔ انہیں ہم تکنیکی اعتبار سے مَدرّس نقاد کہتے ہیں۔ وہ جابر سلطان کی طرف سے پیش کردہ نصابی کتب کے اچھے برے محاسن کو شناخت کر جانے کی زبردست صلاحیت سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان کی approval یا condemnation سے اجتماعی ضمیر میں سماجی اور سیاسی تبدیلی کی لہریں پیدا کر سکتے ہیں۔

اپنی تحقیقات میں سب سے زیادہ ذہنی کرب سے میں تب گزرا جب میں نے اخباری ریکارڈ دیکھے تو کہیں بھی اس افیم کی گولی نما معجون مرکب، متضاد خیالات پر مبنی ناول ''راجہ گدھ'' پر ان مدرس نقادوں کی طرف سے کوئی ردعمل نظر نہ آیا۔ اگر اپنی ذات کی حد تک کسی نے اسے Anti Society سمجھا ہو تو علم نہیں۔ کالجوں، یونیورسٹیوں میں روشن ضمیر پروفیسروں اور اساتذہ کی باقاعدہ تطہیر کی گئی جن میں سے مجھے پروفیسر وارث میر اور پروفیسر مہدی حسن یاد ہیں باقی ملک کے کالج اور یونیورسٹیوں سے کتنے محترم لوگوں کو خارج کیا گیا اس پر کسی علیحدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور لازمی تحقیق ہونی بھی چاہیے تاکہ تاریخی ریکارڈ میں ایسے روشن ضمیر اساتذہ کی یاد آنے والی نسلوں کے لیے روشن استعارہ بن کے رہے۔ ان لوگوں نے جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کا خوف محسوس نہ کیا۔ صحافیوں میں جن روشن ضمیروں نے علم بغاوت بلند کیا ان کا ریکارڈ تو جناب حفظ الرحمٰن نے کتاب لکھ کر محفوظ کر دیا۔ میرے علم میں آیا ہے کہ بعض پروفیسر حضرات نے اس ناول کو مختلف یونیورسٹیوں میں ایم۔ اے اردو کے سلیبس کا حصہ بنوانے میں بڑی تگ و دو کی۔

مجھے حیرت ہوتی ہے ان صاحبانِ عقل میں سے کوئی بھی نہ دیکھ سکا کہ بانو قدسیہ محترمہ نے Gene Theory کا سارا مواد 1975ء میں چھپنے والی رچرڈ ڈکنز کی کتاب Selfish Gene سے لیا جو امریکی حکومت اور بعد ازاں برطانیہ میں وکٹورین دور سے

پلنے والے نسلی تفاخر کی ماڈرن شکل تھی۔ بانو قدسیہ محترمہ نے بس اس میں حرام حلال کا تڑکا لگا کر اسے پروفیسر سہیل کی تھیوری بنا دیا۔

پھر پروفیسر سہیل جب قیوم کو بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو من وسلویٰ کھلایا جس کی وجہ سے ان اسرائیلیوں میں آج تک کتنے سوپر ذہن لوگ پیدا ہوتے ہیں (صفحہ 350)۔ آپ اساتذہ کرام ہرگز نہ پکڑ سکے کہ سورہ بقرہ کی آیت 61 میں اللہ تعالیٰ انہی اسرائیلیوں کو کس طرح مخاطب کرتے ہیں۔ آپ کیوں نہ چیخ اٹھے کہ بابا یہودیت کا دورِ ابتلاء عیسائیت کی تبلیغ سے جڑا ہوا ہے۔ عیسائیت نے اپنے پھیلاؤ کے دوران یہودیوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے تو یہودی دنیا کے مختلف کونوں میں تتر بتر ہو گئے۔ یہودی پہلے قریباً 1000 سال قبل مسیح میں ایرانیوں کے ہاتھوں قید ہو کر جلاوطن کر دیئے گئے۔ ہیکل سلیمانی نابود کر دی گئی۔ تورات اور زبور کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ ایرانیوں کی 80 سالہ قید کے دوران ان کی تذلیل نے انہیں مجبور کیا کہ یہودی ایک ملی تعصب قائم کریں۔ بعد ازاں عیسائیت کی شدتِ تبلیغ کے نتیجہ میں یہودی قوم گروہی صورت میں مختلف ممالک میں جا بسی۔ زر اور سونے کا کاروبار ان کا پسندیدہ ہو گیا۔ ایک Closed Society کے طور پر اپنے بچوں کی خاص تربیت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا اس لئے زیادہ تر سائنس دان اور مفکر ان میں پیدا ہونا شروع ہوئے۔ دنیا کا پہلا بینک انہوں نے قائم کیا اور دنیا میں فیڈرل ریزرو بینک آف امریکہ (جس میں ڈالر چھاپنے کا اختیار یہودیوں کو ہی ہے) بینک آف انگلینڈ اور تمام دنیا کے سونے کے اکثر مالک یہی یہودی ہیں۔ پھر پروفیسر سہیل راجہ گدھ میں یہودیوں کی دو شاخوں میں سے کس شاخ کی بات کرتے ہیں؟ سامی النسل یہودیوں کی یا بحر خضر کے کنارے ولد الحرام نسل کے سفید چمڑی والے نیلی، بھوری آنکھوں والے یہودیوں کی جنہوں نے چند صدیاں قبل ہی یہودی مذہب

اختیار کیا تھا۔ دیکھئے ڈاکٹر کامران مجاہد کی انٹرنیشنل بینکاروں پر کتاب اور دوسری Silk Roads-A New History of the World by Peter Fronkopan۔

آپ مدرس نقاد راجہ گدھ پر من وعن ایمان لے آئے۔ پھر آپ اس پر کیوں تنقید کرتے !!! کیوں کہ بانو قدسیہ محترمہ جانتی تھیں کہ سب سے زیادہ ذہین طبقہ آپ ہی ہیں لہٰذا پروفیسر سہیل کی زبانی آپ کی روح حریت کو سلا کر نیئے آدرش سکھا رہی تھیں۔ اور وہ آپ پر پروفیسر سہیل کی چھاپ لگانے میں کامیاب بھی ہوگئیں۔ صفحہ 367:

''میں اب انیسویں گریڈ کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ پھر میں پروفیسر ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں پاکستانی طلبہ کو تعلیم دینے کا مشن لے کر تمہارے کالج آیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ وہ مشن میرے بس کا نہیں اسی لیے میں نے اپنی تبدیلی نیو کیمپس میں کرالی۔ تعلیم جب سے عام ہوئی لوگ تعلیم کی تلاش میں نہیں رہے اس لئے میں نے اپنا مشن بدل لیا ہے۔ میں اب فقط زندگی بنانا چاہتا ہوں۔''

لیجیے ! آپ بھی اس دور پر آشوب میں۔۔۔ جب آپ سے انقلاب کی توقع تھی۔۔۔ آپ نے بھی آسان ترین راستہ چنا اور خاموشی سے اپنی زندگیاں بنانے اور گریڈوں کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ اس ناول میں کئی جگہ ادبی بد ذوقی کے جملے موجود ہیں اس میں کئی جگہ جملوں کی بناوٹ غلط ہے۔ اس ناول میں فلسفیانہ تضاد اور ناامیدی کی واضح دلیلیں ہیں۔ اس میں مافوق الفطرت واقعات ہیں جو ماضی پرستی اور Status Quo کو برقرار رکھنے کے اسباق ہیں۔ بانو قدسیہ محترمہ کے گھر آکر اس کے بیٹوں کے دوست گلاس میں روحیں بلانے کے جو کھیل کھیلتے تھے (راہ رواں ملاحظہ ہو) ان کو من وعن انہوں نے پروفیسر سہیل کے ذریعے اس ناول میں ٹھونس کر کیا بتانا چاہا؟

کیا آپ کی ذہین اور متجسس نگاہ ان حماقتوں اور لایعنی باتوں کو نہ پکڑ سکی ؟ کیا آپ نے کبھی گلاس میں روحیں بلا کر اب کبھی اشفاق مرحوم کی روح یا کسی اور روح کو بلا کر کچھ ان کا حال احوال پوچھا؟ میں حیران ہوتا ہوں جب یہ مدرس نقاد مات کھا گئے اور آج 35 برس تک اپنے طلبہ و طالبات کو اس ناول کے کون کون سے محاسن بیان کر کے ذہنوں کو ہر سال منور کر کے یونیورسٹیوں اور کالجوں سے فارغ کیا ہوگا؟ اور راجہ گدھ کے فلسفہ حیات سے منور وہ آپ کے فارغ التحصیل اذہان معاشرہ میں کن نظریات کے تحت کیسی گومگو ذہنی کیفیات کی زندگیاں بسر کر رہے ہونگے ؟ اب بھی وقت ہے موجودہ اور آنے والی نسلوں کو حقیقی جدلیاتی اور مجادلاتی اوزاروں سے لیس دلائل کے ساتھ زیورِ تعلیم دینے پر کمر کس لیں۔ آپ وہ ہراول دستہ ہیں جس نے ادب وحرف کی دنیا میں آنے والی ہر کتاب کو اپنے سماج کی بہتری کی خاطر یا قبول عام کی سند سے مزین کرنا ہوتا ہے یا پھر اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینکنے کا حکم صادر کرنا ہوتا ہے۔ ہاں ایک شخص قابل سیلوٹ ہے۔ جناب ڈاکٹر آغا سہیل صاحب سابقہ وائس چانسلر جی۔ سی یونیورسٹی لاہور۔ میرے علم کے مطابق جب لاہور میوزیم کے آڈیٹوریم میں راجہ گدھ کی تقریبِ رونمائی ہوئی تو انہوں نے سٹیج پر برملا کہا تھا کہ یہ دوغلا ناول ہے۔ یعنی یہ ایک دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ دو اذہان کا کرشمہ ہے۔ اور وہ دونوں شخصیات میرے سامنے موجود ہیں۔

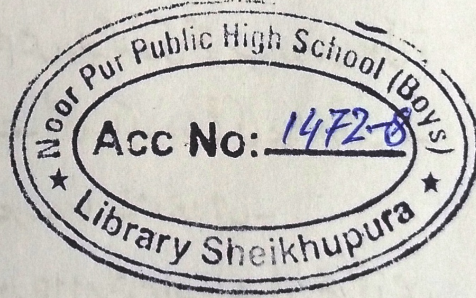
ملاحظہ فرمایئے راجہ گدھ کے صفحہ 118 اور 119 پر شام اور رات کی منظر کشی میں اسلوبِ بیاں یکدم تبدیل ہو جاتا ہے اور واضح طور پر احساس ہوتا ہے کہ یہ تحریر بانو قدسیہ محترمہ کے اندازِ بیاں سے ہرگز میل نہیں کھاتی۔ اسی طرح (صفحہ 420) %95 مرد اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے وقت ذہن میں کال اپنی محبوبہ سے ملا کر رکھتے ہیں۔۔۔ اس جیسی غلیظ بات کسی خاتون کے ذہن میں تو نہیں آ سکتی۔ یہ بات لازماً کسی مرد کی طرف سے ناول لکھتے وقت تحفتاً ملی ہوگی۔ اور یہیں پر ڈاکٹر آغا سہیل سچے

نظر آتے ہیں۔

آپ مدرس نقادوں کے پاس اب بھی وقت ہے کہ اس ناول میں موجود کئی ایک Thesisاور پھران کے Anti Thesis کو شناخت کر کے طلبہ و طالبات کے سامنے ان کی چالاکیوں کے پول کھولیں اور ان کے، ممکن ہو سکے تو، سنتھیسز بھی لکھیں۔ مغربی تعلیم زدہ طلبہ و طالبات سے بانو قدسیہ محترمہ کی کیا مراد ہے؟ یہ کیوں جدید پڑھی لکھی لڑکیوں کی میٹھی دشمن ہیں اور عابدہ یا امتل (بقول خود بانو قدسیہ محترمہ کے چلا ہوا کارتوس نما) جیسی عورتوں کی زبان سے بڑے بڑے فلسفے بیان کرواتی ہیں اور جدید تعلیم یافتہ لڑکیوں کی یونیورسٹیوں میں آمد کو محض مناسب شوہروں کی تلاش یا عشق لا حاصل کا شکار کرنے والیاں بتاتی ہیں۔

وما الینا الا البلغ المبین

ooo





راست فکر اور عملیت پسند دانشور غلام حسین غازی نے ''راجہ گدھ'' میں بیان کیے گئے فلسفے کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ایک ایک لفظ کو حقائق کے ترازو پر تول کر نہ صرف ''راجہ گدھ'' بلکہ محترمہ بانو قدسیہ اور جناب اشفاق احمد کے گفتاری اور کتابی تصوف کے نظریے پر کئی سوال کھڑے کر دیئے ہیں۔ اور ان میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔

غلام حسین غازی کی نظر میں باطنی اور مخفی تصورات کے خاتمے اور تشریح عالم کے میکانی فلسفے کے دور میں رزق حرام کے نتائج کے طور پر خون کے خلیوں کی شکست و ریخت کا نظریہ موجود سائنسی تحقیق اور گہرے سماجی مطالعے کے ترازو پہ بے وزن ہو چکا ہے۔ میکانی فلسفے کی جزئیات نے جدید عصبی فعالیات کے علم، نیز فیزالوجی اور ادراک کے مفروضات کا راستہ بھی ہموار کیا۔ اب جسم اور ذہن کے تنازعہ کا کوئی باقاعدہ وجود نہیں۔

گل سلطان اعوان

Design By: MUHAMMAD AHSUN Gull

بُک ہوم



بک سٹریٹ 46 - مزنگ روڈ لاہور' پاکستان فون : 37245072 - 042-37231518

E-mail: bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www. bookhomepublishers.com